QuranUrdu.com

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۳۳)

QuranUrdu.com

الاحزاب

نام آیت ۲۰ کے فقرہ یَحۡسَبُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ لَمۡ یَذۡهَبُوۡا سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزُول اس سورت کے مضامین تین اہم واقعات سے بحث کرتے ہیں: ایک، غزوۂ اَحزاب جو شوال ۵ھ میں پیش آیا۔ دوسرے، غزوۂ بنی قُرَیظَہ جو ذِی القَعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ تیسرے، حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جو اسی سال ذی القعدہ میں ہوا۔ ان تاریخی واقعات سے سورت کا زمانۂ نزول ٹھیک متعیّن ہو جاتا ہے۔

تاریخی پَسِ منظر جنگِ اُحُد (شوال ۳ھ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے تیر اندازوں کی غلطی سے لشکرِ اسلام کو جو شکست نصیب ہوگئی تھی اس کی وجہ سے مشرکینِ عرب، یہود اور منافقین کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور انھیں اُمید بندھ چلی تھی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا قَلع قَمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان بڑھتے ہوئے حوصلوں کا اندازہ ان واقعات سے ہوسکتا ہے جو اُحُد کے بعد پہلے ہی سال میں پیش آئے۔ جنگِ اُحُد پر دو مہینوں سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ نجد کے قبیلۂ بنی اَسَد نے مدینۂ طَیِّبہ پر چھاپا مارنے کی تیاریاں کیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی روک تھام کے لیے سَرِیَّۂ[1] ابو سَلَمہ بھیجنا پڑا۔ پھر صفر ۴ھ میں قبائلِ عَضَل اور قارَہ نے حضورؐ سے چند آدمی مانگے تاکہ وہ ان کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دینِ اسلام کی تعلیم دیں۔ حضورؐ نے چھ اصحاب کو ان کے ساتھ کر دیا۔ مگر رَجیع (جِدّہ اور رابِغ کے درمیان) پہنچ کر وہ لوگ قبیلۂ ہُذَیل کے کفار کو ان بے بس مبلّغین پر چڑھا لائے، ان میں سے چار کو قتل کر دیا، اور دو صاحبوں (حضرت خُبَیبؓ بن عَدِی، اور حضرت زیدؓ بن الدَّثِنَّہ) کو لے جا کر مکۂ معظّمہ میں دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پھر اسی ماہ صفر میں بنی عامر کے ایک سردار کی درخواست پر حضورؐ نے ایک اور تبلیغی وفد جو چالیس (یا بقولِ بعض ۷۰) انصاری نوجوانوں پر مشتمل تھا، نجد کی طرف روانہ کیا۔ مگر ان کے ساتھ بھی غداری کی گئی اور بنی سُلَیم کے قبائل عُصَیَّہ اور رِعل اور ذَکوان نے بِئرِ معونہ کے مقام پر اچانک نرغہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ اسی دوران میں مدینے کا یہودی قبیلہ بنی النَّضِیر دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا، یہاں تک کہ ربیع الاوّل ۴ھ میں اُس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کی سازش تک کر ڈالی۔ پھر جُمادِی الاُولیٰ ۴ھ میں بنی غَطَفان کے دو قبیلوں، بنو ثَعلَبَہ اور بنو مُحارِب نے مدینے پر حملے کی تیاریاں کیں اور حضورؐ کو خود ان کی روک تھام کے لیے جانا پڑا۔ اس طرح جنگِ اُحُد کی شکست سے جو ہوا اُکھڑی تھی، وہ مسلسل سات آٹھ مہینے تک اپنا رنگ دکھاتی رہی۔

---

1 اصطلاح میں سَرِیَّہ اُس فوجی مہم کو کہتے ہیں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک نہ ہوتے تھے۔ اور غَزوہ اُس جنگ یا مہم کو کہا جاتا ہے جس میں حضورؐ خود قیادت فرماتے تھے۔

QuranUrdu.com

لیکن وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم و تدبر اور صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ فدا کاری تھا جس نے تھوڑی مدت کے اندر ہی حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ عربوں کے مَعاشی مُقاطَعے نے اہلِ مدینہ کے لیے جینا دشوار کر رکھا تھا۔ گِردوپیش کے تمام مشرک قبائل چیرہ دست ہو رہے تھے۔ خود مدینے کے اندر یہود اور منافقین مارِ آستین بنے ہوئے تھے۔ مگر ان مٹھی بھر مومنینِ صادقین نے رسولِ خدا کی قیادت میں پے در پے ایسے اقدامات کیے جن سے عرب میں اسلام کا رعب صرف بحال ہی نہیں ہوگیا، بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔

جنگِ احزاب سے پہلے کے غزوات

ان میں سے اوّلین اقدام وہ تھا جو جنگِ اُحُد کے فوراً ہی بعد کیا گیا۔ جنگ کے ٹھیک دوسرے روز، جب کہ بکثرت مسلمان زخمی تھے اور بہت سے گھروں میں عزیزترین اقارب کی شہادت پر کُہرام برپا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی زخمی اور حضرت حمزہؓ کی شہادت پر دل فِگار تھے، حضورؐ نے اسلام کے فدائیوں کو پکارا کہ لشکرِ کفار کے تعاقُب میں چلنا ہے، تاکہ وہ کہیں راستے سے پلٹ کر پھر مدینے پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ حضورؐ کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا کہ کفارِ قریش ہاتھ آئی ہوئی فتح کا کوئی فائدہ اُٹھائے بغیر واپس تو چلے گئے ہیں، لیکن راستے میں جب کسی جگہ ٹھیریں گے تو اپنی اس حماقت پر نادم ہوں گے اور دوبارہ مدینے پر چڑھ آئیں گے۔ اس بنا پر آپؐ نے ان کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور فوراً ۶۳۰ جاں نثار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مکے کے راستے میں جب حَمْراءُ الاَسَد پہنچ کر آپؐ نے تین روز تک پڑاؤ کیا تو ایک ہمدرد غیرمسلم کے ذریعے سے آپؐ کو معلوم ہوگیا کہ ابوسفیان اپنے ۲۹۷۸ آدمیوں کے ساتھ مدینے سے ۳۶ میل دُور اَلرَّوحا کے مقام پر ٹھیرا ہوا تھا اور یہ لوگ فی الواقع اپنی غَلَطی کو محسوس کر کے پھر پلٹ آنا چاہتے تھے، لیکن یہ سُن کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر لیے ہوئے ان کے تعاقب میں چلے آ رہے ہیں۔ اس کارروائی کا صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ قریش کے بڑھے ہوئے حوصلے پست ہوگئے، بلکہ گردوپیش کے دشمنوں کو بھی یہ معلوم ہوگیا کہ مسلمانوں کی قیادت ایک انتہائی بیدار مغز اور اُولُوالْعَزم ہستی کر رہی ہے اور مسلمان اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، دیباچہ، حاشیہ ۱۲۲)

پھر جونہی کہ بنی اَسَد نے مدینے پر چھاپا مارنے کی تیاریاں شروع کیں، حضورؐ کے مُخبروں نے بروقت آپؐ کو ان کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔ قبل اس کے کہ وہ چڑھ کر آتے، آپؐ نے حضرت ابوسَلَمہؓ (اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کے پہلے شوہر) کی قیادت میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک لشکر ان کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ یہ فوج اچانک ان کے سر پر پہنچ گئی۔ بدحواسی کے عالم میں وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کا سارا مال اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔

اس کے بعد بنی النَّضِیر کی باری آئی۔ جس روز انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی اور اس کا راز فاش ہوا اُسی روز آپؐ نے ان کو نوٹس دے دیا کہ دس دن کے اندر مدینے سے نکل جاؤ، اس کے بعد تم میں سے جو یہاں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ منافقینِ مدینہ کے سردار عبداللہ بن اُبَیّ نے ان کو تڑی دی کہ

QuranUrdu.com

ڈٹ جاؤ اور مدینہ چھوڑنے سے انکار کر دو، میں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمھاری مدد کروں گا، بنی قُرَیظَہ تمھاری مدد کریں گے، اور نجد سے بنی غَطَفان بھی تمھاری مدد کے لیے آئیں گے۔ ان باتوں میں آ کر انھوں نے حضورؐ کو کہلا بھیجا کہ ہم اپنا علاقہ نہیں چھوڑیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ حضورؐ نے نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے حامیوں میں سے کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ مدد کو آتا۔ آخر کار انھوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ ان میں سے ہر تین آدمی ایک اونٹ پر جو کچھ لاد کر لے جا سکتے ہیں، لے جائیں گے اور باقی سب کچھ مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں گے۔ اس طرح مضافات مدینہ کا وہ پورا محلّہ جس میں بنی نضیر رہتے تھے، ان کے باغات اور گڑھیوں اور سر وسامان سمیت مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا اور اس بدعہد قبیلے کے لوگ خَیبَر، وادی القُریٰ اور شام میں تتر بتر ہو گئے۔

پھر آپؐ نے بنی غَطَفان کی طرف توجہ کی جو مدینے پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ آپؐ چار سو کا لشکر لے کر نکلے اور ذات الرِّقاع کے مقام پر ان کو جا لیا۔ اس اچانک حملے نے ان کے حواس باختہ کر دیے اور کسی جنگ کے بغیر وہ اپنے گھر بار اور مال اسباب چھوڑ کر پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔

اس کے بعد شعبان ۴ھ میں آپؐ ابوسفیان کے اُس چیلنج کا جواب دینے کے لیے نکلے جو اُس نے اُحُد سے پلٹتے ہوئے دیا تھا۔ خاتمۂ جنگ پر اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف رُخ کر کے اعلان کیا تھا کہ **اِنَّ مَوْعِدَكُمْ بَدَرٌ لِلْعَامِ الْمُقْبِل** (آیندہ سال بَدر کے مقام پر ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہوگا)، اور حضورؐ نے جواب میں ایک صحابی کے ذریعے سے یہ اعلان کرا دیا تھا کہ **نَعَمْ، هِيَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدٌ** (ٹھیک ہے، یہ بات ہمارے اور تیرے درمیان طے ہوگئی۔) اس قرارداد کے مطابق طے شدہ وقت پر آپؐ ۱۵ سو صحابیوں کو لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اُدھر سے ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لے کر چلا، مگر مَرُّ الظَّہران (موجودہ وادیِ فاطمہ) سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ حضورؐ نے بدر میں آٹھ دن اس کا انتظار کیا اور اس دَوران میں مسلمان تجارت کر کے ایک درہم کے دو درہم کماتے رہے۔ اس واقعہ سے وہ دھاک جو اُحُد میں اکھڑی تھی پہلے سے بھی زیادہ جم گئی۔ اس نے پورے عرب پر یہ بات کھول دی کہ اب تنہا قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (اس کی مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۱۲۴)

اس دھاک میں ایک اور واقعے نے مزید اضافہ کیا۔ عرب اور شام کی سرحد پر دُومَۃُ الجَندَل (موجودہ الجَوف) ایک اہم مقام تھا جہاں سے عراق اور مصر و شام کے درمیان عرب کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس مقام کے لوگ قافلوں کو تنگ کرتے اور اکثر لُوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاوّل ۵ھ میں ایک ہزار کا لشکر لے کر ان کی تادیب کے لیے خود تشریف لے گئے۔ وہ آپؐ کے مقابلے کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس سے پورے شمالی عرب پر اسلام کی ہیبت بیٹھ گئی اور قبائل نے یہ سمجھ لیا کہ مدینے میں جو زبردست طاقت پیدا ہوئی ہے، اس کا مقابلہ اب ایک دو قبیلوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

QuranUrdu.com

عہدِ نبوی میں قبائلِ عرب کے علاقے

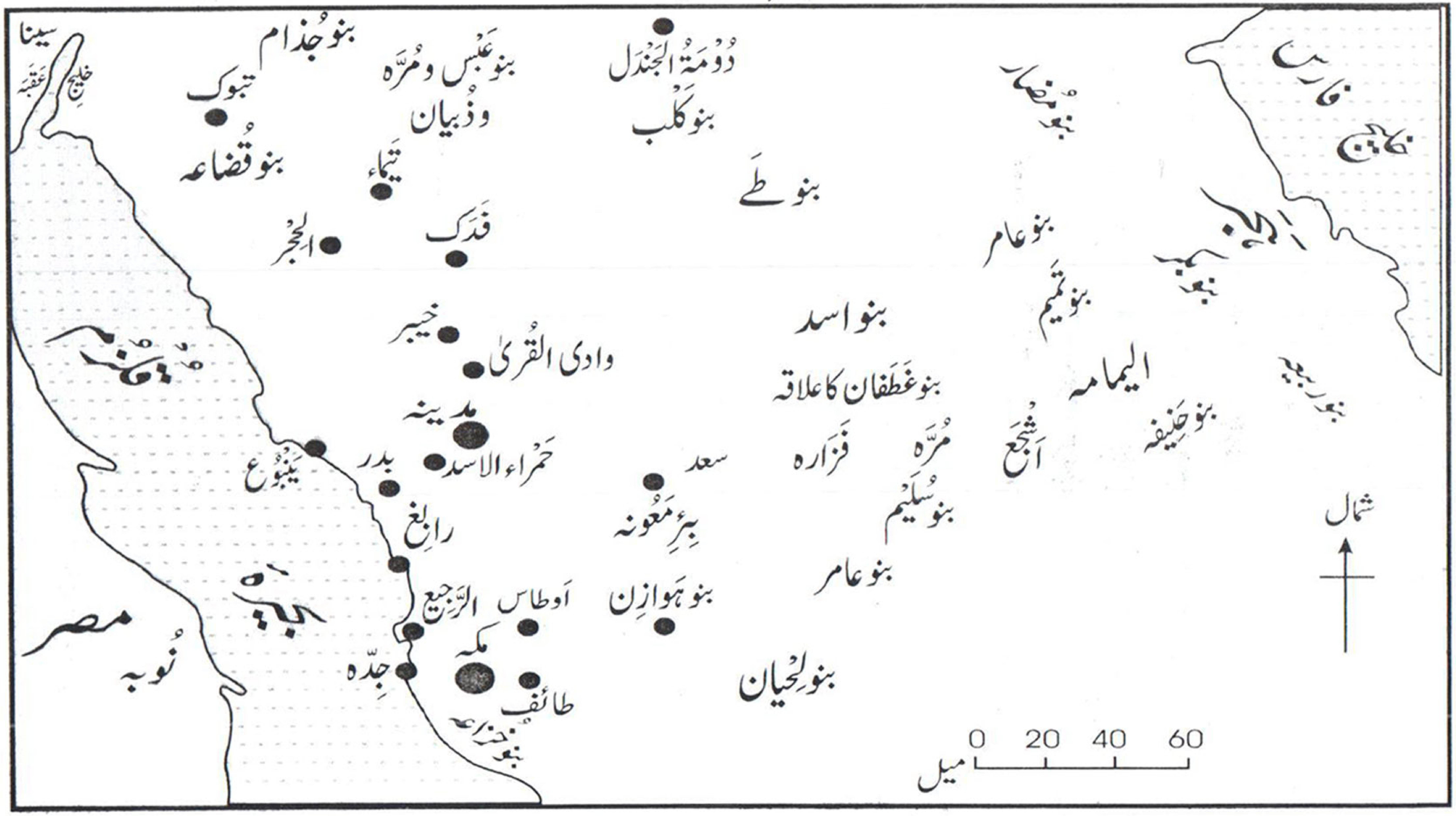

QuranUrdu.com

غزوۂ اَحزاب

یہ حالات تھے جن میں غزوۂ اَحزاب پیش آیا۔ یہ غزوہ دراصل عرب کے بہت سے قبائل کا ایک مشترک حملہ تھا جو مدینے کی اِس طاقت کو کچل دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی تحریک بنی النَّضِیر کے اُن لیڈروں نے کی تھی جو مدینے سے جَلا وطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔ انھوں نے دَورہ کر کے قریش اور غَطَفان اور ہُذَیل اور دوسرے بہت سے قبائل کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سب مل کر بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مدینے پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے شوال ۵ ھ میں قبائلِ عرب کی اتنی بڑی جمعیت اس چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہو گئی جو اس سے پہلے عرب میں کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔ اس میں شِمال کی طرف سے بنی النَّضِیر اور بنی قَیْنُقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینے سے جَلاوطن ہو کر خیبر اور وادی القُریٰ میں آباد ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف سے غَطَفان کے قبائل (بنو سُلَیم، فَزَارہ، مُرَّہ، اَشْجَع، سَعْد اور اَسَد وغیرہ) نے پیش قدمی کی۔ اور جنوب کی طرف سے قریش اپنے حلیفوں کی ایک بھاری جمعیت لے کر آگے بڑھے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد دس بارہ ہزار تھی۔

یہ حملہ اگر اچانک ہوتا تو سخت تباہ کُن ہوتا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینۂ طیّبہ میں بے خبر بیٹھے ہوئے نہ تھے بلکہ آپؐ کے خبر رساں اور تحریک اسلامی کے ہمدرد اور متاثّرین جو تمام قبائل میں موجود تھے، آپؐ کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے برابر مُطّلَع کرتے رہتے تھے۔[1] قبل اس کے کہ یہ جمِّ غفیر آپؐ کے شہر پہنچتا، آپؐ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شِمال غربی رُخ پر ایک خندق کھدوالی اور کوہِ سَلْع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مُدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینے کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے (اور اب بھی ہیں) کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہ ہو سکتا تھا۔ مشرق میں حَرّات (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کَشی آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف اُحُد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہو سکتا تھا اور اسی جانب حضوؐر نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا۔ یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی نقشے میں تھی ہی نہیں کہ انھیں مدینے کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا، کیونکہ اہلِ عرب اس طریقِ دفاع سے نا آشنا تھے۔ ناچار انھیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔

اس کے بعد کفار کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ گئی تھی، اور وہ یہ کہ بنی قُرَیْظَہ کے یہودی قبیلے کو غدّاری پر آمادہ کریں جو مدینۂ طَیّبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں رہتا تھا۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا جس کی رُو سے مدینے پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مُدافعَت کرنے کا پابند تھا، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچے اُن گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنی قُرَیظَہ کی جانب

---

[1] یہ قوم پرست جتھّوں کے مقابلے میں ایک نظریّاتی تحریک کی فوقیت کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔ قوم پرست جتھّے صرف اپنی قوم کے افراد کی تائید وحمایت ہی پر انحصار رکھتے ہیں۔ لیکن ایک اُصُولی ونظریّاتی تحریک اپنی دعوت سے ہر سَمْت میں بڑھتی ہے اور خود ان جتھوں کے اندر سے اپنے حامی نکال لاتی ہے۔

QuranUrdu.com

نقشہ جنگِ احزاب

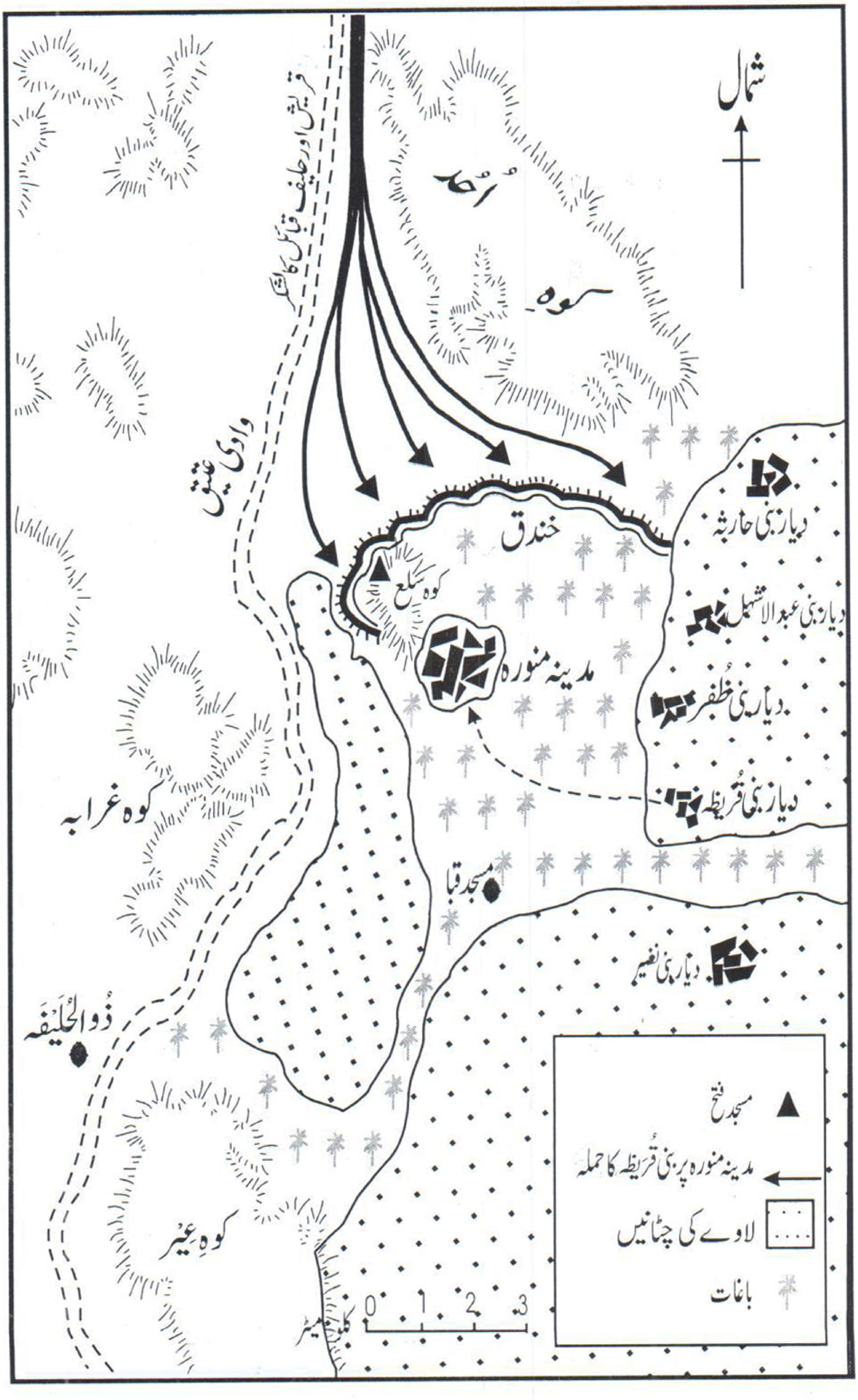

QuranUrdu.com

تھیں اور اُدھر مُدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ اُن کی طرف سے بنی النَّضِیر کا یہودی سردار حُیَیّ بن اَخطَب بنی قُرَیظَہ کے پاس بھیجا گیا، تاکہ انھیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لے۔ ابتداءً انھوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ابنِ اَخطَب نے ان سے کہا کہ "دیکھو، میں اس وقت عرب کی مُتَّحِدہ طاقت اِس شخص پر چڑھا لایا ہوں، یہ اسے ختم کر دینے کا نادر موقع ہے، اس کو اگر تم نے کھو دیا تو پھر دوسرا کوئی موقع نہ مل سکے گا"، تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اَخلاق کے پاس ولحاظ پر غالب آ گئی اور بنی قُرَیظَہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپؐ کو بروقت اس کی اطلاع مل گئی اور آپؐ نے فوراً انصار کے سرداروں (سَعدؓ بن عُبَادہ، سعدؓ بن مُعاذ، عبداللہؓ بن رَواحَہ اور خوّاتؓ بن جُبَیر) کو ان کے پاس تحقیقِ حال اور فہمائش کے لیے بھیجا۔ چلتے وقت آپؐ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اگر بنی قُرَیظَہ عہد پر قائم رہیں تو آ کر سارے لشکر کے سامنے عَلَی الاعلان یہ خبر سنا دینا۔ لیکن اگر وہ نَقضِ عہد پر مُصِرّ ہوں تو صرف مجھ کو اشارتاً اس کی اطلاع دے دینا، تاکہ عام مسلمان یہ بات سن کر پست ہمت نہ ہو جائیں۔ یہ حضرات وہاں پہنچے تو بنی قُرَیظَہ کو پوری خباثت پر آمادہ پایا اور انھوں نے برملا ان سے کہہ دیا کہ لَا عَقدَ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مُحَمَّدٍ وَّلَا عَھْدَ "ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔" اس جواب کو سُن کر وہ لشکرِ اسلام میں واپس آئے اور اشارتاً حضورؐ سے عرض کر دیا: عَضَل وقارَہ۔ یعنی قبیلہ عضل و قارہ نے رجیع کے مقام پر مبلغین اسلام کے وفد سے جو غداری کی تھی، وہی کچھ اب بنی قُرَیظَہ کر رہے ہیں۔

یہ خبر بہت جلدی مدینے کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ دونوں طرف سے گھیرے میں آ گئے تھے اور ان کے شہر کا وہ حصّہ خطرے میں پڑ گیا تھا جدھر دفاع کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور سب کے بال بچے بھی اسی جانب تھے۔ اس پر منافقین کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور انھوں نے اہلِ ایمان کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حملے شروع کر دیے۔ کسی نے کہا کہ "ہم سے وعدے تو قیصر و کِسریٰ کے ملک فتح ہو جانے کے کیے جا رہے تھے، اور حال یہ ہے کہ ہم رفعِ حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے۔" کسی نے یہ کہہ کر خندق کے محاذ سے رخصت مانگی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں ہمیں جا کر اُن کی حفاظت کرنی ہے۔ کسی نے یہاں تک خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حملہ آوروں سے اپنا معاملہ دُرست کر لو اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے حوالے کر دو۔ یہ ایسی شدید آزمائش کا وقت تھا جس میں ہر اس شخص کا پردہ فاش ہو گیا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی نفاق موجود تھا۔ صرف صادق و مخلص اہلِ ایمان ہی تھے جو اس کڑے وقت میں بھی فداکاری کے عزم پر ثابت قدم رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر بنی غَطفان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور ان کو اس بات پر

QuranUrdu.com

آمادہ کرنا چاہا کہ مدینے کے پھلوں کی پیداوار کا ۱/۳ حصّہ لے کر واپس چلے جائیں۔ لیکن جب انصار کے سرداروں (سعدؓ بن عُبادہ اور سعدؓ بن مُعاذ) سے آپؐ نے ان شرائطِ صلح کے متعلق مشورہ طلب کیا تو انھوں نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! یہ آپؐ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں؟ یا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے لیے اِسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے؟ یا آپؐ صرف ہمیں بچانے کے لیے یہ تجویز فرمارہے ہیں؟'' آپؐ نے جواب دیا ''میں صرف تم لوگوں کو بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متحد ہو کر تم پر پِل پڑا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ دوں۔'' اس پر دونوں سرداروں نے بالاتفاق کہا کہ ''اگر آپؐ ہماری خاطر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ یہ قبیلے ہم سے اُس وقت بھی ایک حَبّہ خَراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب ہم مشرک تھے۔ اور اب تو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کا شَرَف ہمیں حاصل ہے، کیا اب یہ ہم سے خَراج لیں گے؟ ہمارے اور ان کے درمیان اب صرف تلوار ہے، یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کر دے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے معاہدے کے اس مُسَوَّدے کو چاک کر دیا جس پر ابھی فریقین کے دستخط نہ ہوئے تھے۔

اسی دَوران میں قبیلۂ غَطَفان کی شاخ اَشْجَع کے ایک صاحب نُعَیمؓ بن مسعود مسلمان ہو کر حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے قبولِ اسلام کا علم نہیں ہے، آپؐ مجھ سے اس وقت جو خدمت لینا چاہیں، میں اسے انجام دے سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی تدبیر کرو۔[1] چنانچہ وہ پہلے بنی قُرَیظَہ کے پاس گئے جن سے ان کا بہت میل جول تھا، اور ان سے کہا کہ قریش اور غَطَفان تو محاصرے سے تنگ آ کر واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا کچھ نہ بگڑے گا، مگر تمھیں مسلمانوں کے ساتھ اسی جگہ رہنا ہے، وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمھارا کیا بنے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصہ نہ لو جب تک اِن باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمھارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیے جائیں۔ یہ بات بنی قُرَیظَہ کے دل میں اُتر گئی اور انھوں نے مُتَّحِدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غَطَفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنی قُرَیظَہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آ رہے ہیں، بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمی مانگیں اور انھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ذرا ان کے ساتھ ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔ اس سے مُتَّحِدہ محاذ کے لیڈر بنی قُرَیظَہ کی طرف سے کھٹک گئے اور انھوں نے قُرَظی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اس طویل محاصرے سے اب ہم تنگ آ گئے ہیں، اب ایک فیصلہ کُن لڑائی ہو جانی چاہیے، کل تم اُدھر سے حملہ کرو اور ہم اِدھر سے یک بارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بنی قُرَیظَہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ لوگ جب تک اپنے چند نمایاں آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہ کر دیں، ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے مُتَّحِدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین آ گیا کہ نُعَیم کی بات سچی تھی۔ انھوں نے یرغمال دینے

---

[1] اسی موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا: اَلحَربُ خُدعَۃٌ، یعنی جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے۔

QuranUrdu.com

سے انکار کر دیا اور اس سے بنی قُرَیظہ نے سمجھ لیا کہ نُعَیم نے ہم کو ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔

اب محاصرہ ۲۵ دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اتنے بڑے لشکر کے لیے پانی اور غذا اور چارے کی فراہمی بھی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھوٹ پڑ جانے سے بھی محاصرین کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس حالت میں یکایک ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی اور کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سُجھائی دیتا تھا۔ آندھی کے زور سے دشمنوں کے خیمے اُلٹ گئے اور ان کے اندر شدید افراتفری برپا ہوگئی۔ قدرتِ خداوندی کا یہ کاری وار وہ نہ سہ سکے۔ راتوں رات ہر ایک نے اپنے گھر کی راہ لی، اور صبح جب مسلمان اُٹھے تو میدان میں ایک دشمن بھی موجود نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان کو دشمنوں سے خالی دیکھ کر فوراً ارشاد فرمایا: لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھٰذا ولٰکنّکم تغزونھم، یعنی ''اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے۔ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔'' یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔ قریش ہی نہیں، سارے دشمن قبائل متحد ہو کر اسلام کے خلاف اپنا آخری داؤں چل چکے تھے۔ اس میں ہار جانے کے بعد ان میں یہ ہمت ہی باقی نہ رہی تھی کہ مدینے پر حملہ آور ہونے کی جرأت کر سکتے۔ اب حملے (offensive) کی قوت دشمنوں سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔

غزوۂ بنی قُرَیظہ خندق سے پلٹ کر جب حضورؐ گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبریلؑ نے آ کر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں، بنی قُرَیظہ کا معاملہ باقی ہے، ان سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہی حضورؐ نے فوراً اعلان فرمایا کہ ''جو کوئی سَمع و طاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قُرَیظہ پر نہ پہنچ جائے۔'' اس اعلان کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ کو ایک دستے کے ساتھ مُقَدِّمَۃُ الْجَیْش کے طور پر بنی قُرَیظہ کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن یہ بدزبانی ان کو اس جرمِ عظیم کے خمیازے سے کیسے بچا سکتی تھی کہ انھوں نے عین لڑائی کے وقت معاہدہ توڑ ڈالا اور حملہ آوروں سے مل کر مدینے کی پوری آبادی کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کر دیا۔ حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں۔ لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ محاصرے کی شدت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے اور آخرِ کار انھوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کہ قبیلہ اَوس کے سردار حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کر دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ انھوں نے حضرت سعدؓ کو اس اُمید پر حَکَم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں اَوس اور بنی قُرَیظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدّتوں سے چلے آ رہے تھے، وہ ان کا لحاظ کریں گے اور انھیں بھی اسی طرح مدینے سے نکل جانے دیں گے جس طرح پہلے بنی قَیْنُقاع اور بنی النَّضِیر کو نکل جانے دیا گیا تھا۔ خود قبیلۂ اَوس کے لوگ بھی حضرت سعدؓ سے تقاضا کر رہے

QuranUrdu.com

تھے کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ نرمی برتیں۔ لیکن حضرت سعدؓ ابھی ابھی دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن دو یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نکل جانے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینے پر دس بارہ ہزار کا لشکر چڑھا لائے تھے۔ اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اِس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہلِ مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قُرَیظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قُرَیظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انھیں پتا چلا کہ جنگِ احزاب میں حصّہ لینے کے لیے ان غداروں نے ۱۵ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور ۱۵ سو ڈھالیں فراہم کی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اس وقت مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جب کہ مشرکین یک بارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجایش ہی نہ رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملے میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔

معاشرتی اصلاحات

جنگِ اُحُد اور جنگِ اَحزاب کے درمیان، دو سال کا یہ زمانہ اگرچہ ایسے ہنگاموں کا زمانہ تھا جن کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کو ایک دن کے لیے بھی امن اور اطمینان نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس پوری مدت میں نئے مسلم معاشرے کی تعمیر، اور ہر پہلو میں زندگی کی اصلاح کا کام برابر جاری رہا۔ یہی زمانہ تھا جس میں مسلمانوں کے قوانینِ نکاح و طلاق قریب قریب مکمل ہوگئے، وراثت کا قانون بنا، شراب اور جُوئے کو حرام کیا گیا، اور معیشت و معاشرت کے دوسرے بہت سے پہلوؤں میں نئے ضابطے نافذ کیے گئے۔

اس سلسلے کا ایک اہم مسئلہ جو اصلاح کا تقاضا کر رہا تھا تَبَنِّیت (گود لینے یا بیٹا بنانے) کا مسئلہ تھا۔ عرب کے لوگ جس بچے کو مُتَبَنّٰی بنا لیتے تھے وہ بالکل اُن کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اسے وراثت ملتی تھی۔ اس سے منہ بولی ماں اور منہ بولی بہنیں وہی خلا ملا رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور بھائی سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا اور اس باپ کے مرجانے کے بعد اس کی بیوہ کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا جس طرح سگی بہن اور حقیقی ماں کے ساتھ کسی کا نکاح حرام ہوتا ہے۔ اور یہی معاملہ اس صورت میں بھی کیا جاتا تھا جب منہ بولا بیٹا مرجائے یا اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ منہ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم قدم قدم پر نکاح اور طلاق اور وراثت کے اُن قوانین سے ٹکراتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں مقرر فرمائے تھے۔ اُن کی رُو سے جو لوگ حقیقت میں وراثت کے حق دار تھے، یہ رسم ان کا حق مار کر ایک ایسے شخص کو دلواتی تھی جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ ان کی رو سے جن عورتوں اور مردوں کے درمیان رشتۂ نکاح حلال تھا، یہ رسم ان کے باہمی نکاح کو حرام کرتی تھی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلامی قانون جن بداخلاقیوں کا سدِّ باب کرنا چاہتا تھا، یہ رسم ان کے پھیلنے میں مددگار تھی۔ کیونکہ رسم کے طور پر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدّس پیدا کر دیا جائے،

QuranUrdu.com

بہرحال منہ بولی ماں، منہ بولی بہن اور منہ بولی بیٹی حقیقی ماں، بہن اور بیٹی کی طرح نہیں ہوسکتی۔ ان مصنوعی رشتوں کے رسمی تقدُّس پر بھروسا کر کے مردوں اور عورتوں کے درمیان جب حقیقی رشتہ داروں کا سا خلا ملا ہو تو وہ بُرے نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان وجوہ سے اسلامی قانونِ نکاح وطلاق، قانونِ وراثت اور قانونِ حُرمتِ زنا کا یہ تقاضا تھا کہ مُتَبَنّیٰ کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیُّل کا قطعی اِستیصال کر دیا جائے۔

لیکن یہ تخیل محض ایک قانونی حکم کے طور پر اتنی سی بات کہہ دینے سے ختم نہیں ہوسکتا تھا کہ ''منہ بولا رشتہ کوئی حقیقی رشتہ نہیں ہے۔'' صدیوں کے جمے ہوئے تعصُّبات اور اوہام محض اقوال سے نہیں بدل جاتے۔ حکماً لوگ اس بات کو مان بھی لیتے کہ یہ رشتے حقیقی رشتے نہیں ہیں، پھر بھی منہ بولی ماں اور منہ بولے بیٹے کے درمیان، منہ بولے بھائی اور بہن کے درمیان، منہ بولے باپ اور بیٹی کے درمیان، منہ بولے خُسر اور بہو کے درمیان نکاح کو لوگ مکروہ ہی سمجھتے رہتے۔ نیز ان کے درمیان خلا ملا بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ یہ رسم عملاً توڑی جائے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس اس کو توڑیں۔ کیونکہ جو کام حضورؐ نے خود کیا ہو، اور اللہ کے حکم سے کیا ہو، اس کے متعلق کسی مسلمان کے ذہن میں کراہت کا تصور باقی نہ رہ سکتا تھا۔ اسی بنا پر جنگِ اَحزاب سے کچھ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ کیا گیا کہ آپؐ اپنے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مُطَلَّقہ بیوی سے خود نکاح کر لیں، اور اس حکم کی تعمیل آپؐ نے محاصرۂ بنی قُرَیظہ کے زمانے میں فرمائی۔ (غالباً تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ عدت ختم ہونے کا انتظار تھا، اور اسی دَوران میں جنگی مصروفیات پیش آگئی تھیں۔)

نکاحِ زینبؓ پر پروپیگنڈے کا طوفان

یہ کام ہونا تھا کہ حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان یکلخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ مشرکین اور منافقین اور یہود سب آپؐ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے۔ اُحُد کے بعد اَحزاب اور بنی قُرَیظہ تک دو سال کی مدت میں جس طرح وہ زَک پر زَک اُٹھاتے چلے گئے تھے اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں آگ لگ رہی تھی۔ وہ اس بات سے بھی مایوس ہو چکے تھے کہ اب وہ کھلے میدان میں لڑ کر کبھی آپؐ کو زیر کر سکیں گے۔ اس لیے انھوں نے اس نکاح کے معاملے کو اپنے لیے ایک خدا داد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ اب ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُس اَخلاقی برتری کو ختم کر سکیں گے جو ان کی طاقت اور اُن کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔ چنانچہ یہ افسانے تراشے گئے کہ (معاذ اللہ!) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہو کو دیکھ کر عاشق ہو گئے تھے، بیٹے کو اس تعلقِ خاطر کا علم ہو گیا، اس نے بیوی کو طلاق دے دی، اور باپ نے اس کے بعد بہو سے بیاہ رچا لیا۔ حالانکہ یہ بات صریحاً لَغو تھی۔ حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ بچپن سے جوانی تک اُن کی ساری عمر آپؐ کے سامنے گزری تھی۔ کسی وقت ان کو دیکھ کر عاشق ہو جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آپؐ نے خود اِصرار کر کے حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح کرایا تھا۔ ان کا سارا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اتنے اُونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے۔ خود حضرت زینبؓ بھی اس رشتے سے ناخوش تھیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سب مجبُور ہو گئے، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی شادی کر کے عرب میں اس امر

QuranUrdu.com

کی پہلی مثال پیش کر دی گئی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اُٹھا کر شرفائے قریش کے برابر لے آیا ہے۔ اگر فی الواقع حضوؐر کا کوئی میلان حضرت زینبؓ کی جانب ہوتا تو زیدؓ بن حارثہ سے ان کا نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، آپؐ خود ان سے نکاح کر سکتے تھے۔ لیکن بے حیا مخالفین نے ان سارے حقائق کے موجود ہوتے یہ عشق کے افسانے تصنیف کیے، خوب نمک مرچ لگا لگا کر ان کو پھیلایا اور اس پروپیگنڈے کا صُور اس زور سے پھونکا کہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ان کی گھڑی ہوئی روایات پھیل گئیں۔

پردہ کے ابتدائی احکام

یہ بات کہ دشمنوں کے تصنیف کیے ہوئے یہ افسانے مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھنے سے بھی نہ رُکے اس امر کی کھلی ہوئی علامت تھی کہ معاشرے میں شہوانیت کا عُنصُر حدِّ اعتدال سے بڑھا ہوا تھا۔ یہ خرابی اگر موجود نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ذہن ایسی پاک ہستی کے متعلق ایسے بے سروپا اور اس قدر گھناؤنے افسانوں کی طرف ادنیٰ التفات بھی کرتے، کجا کہ زبانیں ان کو دُہرانے لگتیں۔ یہ ٹھیک موقع تھا جب کہ اسلامی معاشرے میں اُن اصلاحی احکام کے نفاذ کی ابتدا کی گئی جو ''حجاب'' (پردے) کے عنوان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ ان اصلاحات کا آغاز اس سورہ سے کیا گیا، اور ان کی تکمیل ایک سال بعد سورۂ نور میں کی گئی، جب کہ حضرت عائشہؓ پر بہتان کا فتنہ کھڑا ہوا۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، دیباچہ)

حضوؐر کی خانگی زندگی کے معاملات

اسی زمانے میں دو مسئلے اور بھی توجہ طلب تھے۔ اگرچہ بظاہر ان کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی سے تھا، مگر جو ذات اپنی جان خدا کے دین کو پروان چڑھانے کے لیے کھپا رہی تھی اور ہمہ تن اس کارِ عظیم میں منہمک تھی اس کے لیے خانگی زندگی کا سکون فراہم کرنا اور اس کو پریشانیوں سے بچانا، اور اس کو لوگوں کے شکوک وشبہات سے محفوظ رکھنا بھی خود دین ہی کے مفاد کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر ان دونوں مسئلوں کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مالی حیثیت سے انتہائی تنگ حال تھے۔ ابتدائی چار سال تک تو آپؐ کا کوئی ذریعۂ آمدنی تھا ہی نہیں۔ ۴ھ میں بنی النَّضِیر کی جلا وطنی کے بعد ان کی متروکہ زمینوں کا ایک حصّہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ کی ضروریات کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ مگر وہ آپؐ کے کنبے کے لیے کافی نہ تھا۔ اِدھر منصبِ رسالت کے فرائض اتنے بھاری تھے کہ وہ آپؐ کے جسم اور دل و دماغ کی ساری طاقتیں اور آپؐ کے اوقات کا ایک ایک لمحہ سونتے ڈال رہے تھے اور آپؐ اپنی معاش کے لیے ذرّہ برابر بھی کوئی فکر یا کوشش نہ کر سکتے تھے۔ ان حالات میں جب آپؐ کی ازواجِ مطہّراتؓ خرچ کی تنگی کے باعث آپؐ کے سکونِ طبع میں خلل انداز ہوتی تھیں تو اس سے آپؐ کے ذہن پر دُہرا بار پڑ جاتا تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے آپؐ کی چار بیویاں موجود تھیں۔ حضرت سَودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حَفصہؓ اور حضرت اُمّ ِسَلَمہؓ۔ اُمّ المومنین حضرت زینبؓ آپؐ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر مخالفین نے یہ اعتراض اٹھایا، اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس سے شبہات اُبھرنے لگے کہ دوسروں

QuranUrdu.com

کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ٹھیرا دیا گیا ہے، مگر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پانچویں بیوی کیسے کر لی۔

موضوع اور مباحث

یہ مسائل تھے جو سورۂ اَحزاب کے نزول کے زمانے میں پیش آئے تھے اور انھی پر اس سورہ میں کلام فرمایا گیا ہے۔

اس کے مضامین پر غور کرنے، اور پَس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری سورت ایک خطبہ نہیں ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہو، بلکہ یہ متعدد احکام و فرامین اور خطبات پر مشتمل ہے جو اُس زمانے کے اہم واقعات کے سلسلے میں یکے بعد دیگرے نازل ہوئے اور پھر یک جا جمع کر کے ایک سورت کی شکل میں مرتّب کر دیے گئے۔ اس کے حسبِ ذیل اجزا صاف طور پر مُمیَّز نظر آتے ہیں:

۱- پہلا رُکوع غزوۂ احزاب سے کچھ پہلے کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی پَس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس رکوع کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس ضرورت کو محسوس فرما رہے تھے کہ مُتبنّٰی کے بارے میں جاہلیّت کے تصوُّرات اور اَوہام و رُسوم کو مٹایا جائے، اور آپؐ کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ منہ بولے رشتوں کے معاملے میں محض جذباتی بنیادوں پر جس قسم کے نازک اور گہرے تصوُّرات رکھتے ہیں وہ اس وقت تک ہرگز نہ مٹ سکیں گے جب تک آپؐ خود آگے بڑھ کر اس رسم کو نہ توڑ دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپؐ اس بنا پر سخت مُتردِّد تھے اور قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے کہ اگر اس موقع پر آپؐ نے حضرت زیدؓ کی مُطلّقہ بیوی سے نکاح کیا تو اسلام کے خلاف ہنگامہ اُٹھانے کے لیے منافقین اور یہود اور مشرکین کو، جو پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں، ایک زبردست شوشہ ہاتھ آ جائے گا۔ اس موقع پر رکوعِ اوّل کی آیات نازل ہوئیں۔

۲- رُکوع دوم و سوم میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قُرَیظہ پر تبصرہ فرمایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی کُھلی علامت ہے کہ یہ دونوں رکوع ان لڑائیوں کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

۳- چوتھے رُکوع کے آغاز سے آیت ۳۵ تک کی تقریر دو مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو، جو اس تنگی و عُسرت کے زمانے میں بے صبر ہو رہی تھیں، اللہ تعالیٰ نے نوٹس دیا ہے کہ دنیا اور اس کی زینت، اور خدا و رسول اور آخرت میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لو۔ اگر تمھیں پہلی چیز مطلوب ہے تو صاف کہہ دو، تمھیں ایک دن کے لیے بھی اس تنگی میں مبتلا نہ رکھا جائے گا بلکہ بخوشی رخصت کر دیا جائے گا۔ اور اگر دوسری چیز پسند ہے تو صبر کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ساتھ دو۔ دوسرے حصّے میں اُس معاشرتی اصلاح کی طرف پہلا قدم اُٹھایا گیا جس کی ضرورت اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ذہن اب خود محسوس کرنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں اصلاح کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے کرتے ہوئے ازواجِ مطہراتؓ کو حکم دیا گیا کہ تبرُّجِ جاہلیّت سے پرہیز کریں، وَقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور غیر مردوں کے ساتھ بات چیت

QuranUrdu.com

کرنے میں سخت احتیاط ملحوظ رکھیں۔ یہ پردے کے احکام کا آغاز تھا۔

۴- آیت ۳۶ سے ۴۸ تک کا مضمون حضرت زینبؓ کے ساتھ حضورؐ کے نکاح کے سلسلے میں ہے۔ اس میں اُن تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو مخالفین کی طرف سے اس نکاح پر کیے جا رہے تھے، اُن تمام شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی، مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ حضورؐ کا مرتبہ ومقام کیا ہے، اور خود حضورؐ کو کفار ومنافقین کے جھوٹے پروپیگنڈے پر صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

۵- آیت ۴۹ میں طلاق کے قانون کی ایک دفعہ بیان ہوئی ہے۔ یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالباً انھی واقعات کے سلسلے میں کسی موقع پر نازل ہوئی تھی۔

۶- آیت ۵۰-۵۲ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کا خاص ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ حضورؐ ان متعدّد پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں جو ازدواجی زندگی کے معاملے میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں۔

۷- آیت ۵۳-۵۵ میں معاشرتی اصلاح کا دوسرا قدم اٹھایا گیا۔ یہ حسبِ ذیل احکام پر مشتمل ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں غیر مردوں کی آمد ورفت پر پابندی، ملاقات اور دعوت کا ضابطہ، اَزواجِ مطہّراتؓ کے بارے میں یہ قانون کہ گھروں میں صرف ان کے قریبی رشتہ دار آ سکتے ہیں، باقی رہے غیر مرد، تو انھیں اگر کوئی بات کہنی ہو یا کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے کہیں یا مانگیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارے میں یہ حکم کہ وہ مسلمانوں کے لیے ماں کی طرح حرام ہیں اور حضورؐ کے بعد بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

۸- آیت ۵۶-۵۷ میں اُن چہ میگوئیوں پر سخت تنبیہ کی گئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح اور آپؐ کی خانگی زندگی پر کی جا رہی تھیں اور اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ دشمنوں کی اس عیب چینی سے اپنے دامن بچائیں اور اپنے نبیؐ پر درود بھیجیں۔ نیز یہ تلقین بھی کی گئی ہے کہ نبیؐ تو درکنار، اہلِ ایمان کو تو عام مسلمانوں پر بھی تہمتیں لگانے اور الزامات عائد کرنے سے کُلّی اجتناب کرنا چاہیے۔

۹- آیت ۵۹ میں معاشرتی اصلاح کا تیسرا قدم اٹھایا گیا ہے۔ اس میں تمام مسلمان عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ جب گھروں سے باہر نکلیں تو چادروں سے اپنے آپ کو ڈھانک کر اور گھونگٹ ڈال کر نکلیں۔

اس کے بعد آخر سورت تک افواہ بازی کی اس مہم (Whispering Campaign) پر سخت زَجر و توبیخ کی گئی ہے جو منافقین اور سُفَہا و اَراذِل نے اُس وقت برپا کر رکھی تھی۔

QuranUrdu.com

۷۳ ایاتہا

۹ رکوعاتہا

سُوْرَۃُ الْاَحْزَابِ مَدَنِیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ﴿۳﴾

اے نبیؐ[1]! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے[2]۔ پیروی کرو اُس بات کی جس کا اشارہ تمھارے رب کی طرف سے تمھیں کیا جا رہا ہے، اللہ ہر اُس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو[3]۔ اللہ پر توکُّل کرو، اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے[4]۔

۱ — جیسا کہ ہم اس سورہ کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی یہ محسوس فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا اشارہ بھی یہی تھا کہ منہ بولے رشتوں کے معاملے میں جاہلیّت کے رُسوم و اَوہام پر ضرب لگانے کا یہ ٹھیک موقع ہے، اب آپؐ کو خود آگے بڑھ کر اپنے منہ بولے بیٹے (زیدؓ) کی مُطلّقہ سے نکاح کر لینا چاہیے تاکہ یہ رسم قطعی طور پر ٹوٹ جائے۔ لیکن جس وجہ سے حضورؐ اس معاملے میں قدم اُٹھاتے ہوئے جھجک رہے تھے وہ یہ خوف تھا کہ اس سے کفار و منافقین کو، جو پہلے ہی آپؐ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے، آپؐ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے ایک زبردست ہتھیار مل جائے گا۔ یہ خوف کچھ اپنی بدنامی کے اندیشے سے نہ تھا، بلکہ اس بنا پر تھا کہ اس سے اسلام کو زک پہنچے گی، دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متأثّر ہو کر بہت سے لوگ جو اسلام کی طرف میلان رکھتے ہیں بدگمان ہو جائیں گے، بہت سے غیر جانب دار لوگ دشمنوں میں شامل ہو جائیں گے، اور خود مسلمانوں میں سے کمزور عقل و ذہن کے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے حضورؐ یہ خیال کرتے تھے کہ جاہلیّت کی ایک رسم کو توڑنے کی خاطر ایسا قدم اٹھانا خلافِ مصلحت ہے جس سے اسلام کے عظیم تر مقاصد کو نقصان پہنچ جائے۔

۲ — تقریر کا آغاز کرتے ہوئے پہلے ہی فقرے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اِن اندیشوں کو رفع فرما دیا۔ ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ہمارے دین کی مَصلحت کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں ہے، اس کو ہم زیادہ جانتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ کس وقت کیا کام کرنا چاہیے اور کون سا کام خلافِ مصلحت ہے۔ لٰہذا تم وہ طرزِ عمل اختیار نہ کرو جو کفار و منافقین کی مرضی کے مطابق ہو، بلکہ وہ کام کرو جو ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ ڈرنے کے لائق ہم ہیں نہ کہ کفار و منافقین۔

QuranUrdu.com

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي

اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دِل نہیں رکھے ہیں،[۵] نہ اس نے تم لوگوں کی اُن بیویوں کو جن سے تم ظِہار کرتے ہو تمھاری ماں بنا دیا ہے،[۶] اور نہ اس نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔[۷] یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی برحقیقت ہے، اور وہی صحیح

۳ – اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے اور مسلمانوں سے بھی اور مخالفینِ اسلام سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نبی اگر اللہ کے حکم پر عمل کر کے بدنامی کا خطرہ مول لے گا اور اپنی عزت پر دشمنوں کے حملے صبر کے ساتھ برداشت کرے گا تو اللہ سے اس کی یہ وفادارانہ خدمت چھپی نہ رہے گی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ نبیؐ کی عقیدت میں ثابت قدم رہیں گے اور جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں گے، دونوں ہی کا حال اللہ سے مخفی نہ رہے گا۔ اور کفار و منافقین اس کو بدنام کرنے کے لیے جو دوڑ دھوپ کریں گے اس سے بھی اللہ بے خبر نہ رہے گا۔ لہٰذا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے جس جزا یا سزا کا مستحق ہوگا، وہ اسے مل کر رہے گی۔

۴ – اس فقرے کے مخاطَب پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضورؐ کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ جو فرض تم پر عائد کیا گیا ہے اسے اللہ کے بھروسے پر انجام دو اور دنیا بھر بھی اگر مخالف ہو تو اس کی پروانہ کرو۔ جب آدمی کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ فلاں حکم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو پھر اسے بالکل مطمئن ہو جانا چاہیے کہ ساری خیر اور مَصلحت اسی حکم کی تعمیل میں ہے۔ اس کے بعد حکمت و مصلحت دیکھنا اس شخص کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ اسے اللہ کے اعتماد پر صرف تعمیلِ ارشاد کرنی چاہیے۔ اللہ اس کے لیے بالکل کافی ہے کہ بندہ اپنے معاملات اُس کے سُپرد کر دے۔ وہ رہنمائی کے لیے بھی کافی ہے اور مدد کے لیے بھی، اور وہی اِس امر کا ضامن بھی ہے کہ اس کی رہنمائی میں کام کرنے والا آدمی کبھی نتائجِ بد سے دوچار نہ ہو۔

۵ – یعنی ایک آدمی بیک وقت مومن اور منافق، سچا اور جھوٹا، بدکار اور نیکوکار نہیں ہوسکتا۔ اس کے سینے میں دو دل نہیں ہیں کہ ایک دل میں اخلاص ہو اور دوسرے میں خدا سے بے خوفی۔ لہٰذا ایک وقت میں آدمی کی ایک ہی حیثیت ہوسکتی ہے۔ یا تو وہ مومن ہوگا یا منافق۔ یا تو وہ کافر ہوگا یا مُسلم۔ اب اگر تم کسی مومن کو منافق کہہ دو یا منافق کو مومن، تو اس سے حقیقتِ نفس الامری نہ بدل جائے گی۔ اس شخص کی اصل حیثیت لازماً ایک ہی رہے گی۔

۶ – "ظِہار" عرب کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ قدیم زمانے میں عرب کے لوگ بیوی سے لڑتے ہوئے کبھی یہ کہہ بیٹھتے تھے کہ "تیری پیٹھ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے۔" اور یہ بات جب کسی کے منہ سے نکل جاتی تھی تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب یہ عورت

QuranUrdu.com

السَّبِيۡلَ ﴿۴﴾ اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَمَوَالِيۡكُمۡ‌ ؕ وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ فِيۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِهٖ ۙ وَلٰكِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ‌ ؕ

طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ مُنصفانہ بات ہے[8]۔ اور اگر تمھیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں[9]۔ نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے، لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو[10]۔

اس پر حرام ہوگئی ہے کیونکہ وہ اسے ماں سے تشبیہ دے چکا ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کے ساتھ تشبیہ دے دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں تو وہی ہے جس نے آدمی کو جنا ہے۔ محض زبان سے ماں کہہ دینا حقیقت کو نہیں بدل دیتا کہ جو بیوی تھی وہ تمھارے کہنے سے ماں بن جائے۔ (یہاں ظِہار کے متعلق شریعت کا قانون بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس کا قانون سورۂ مجادلہ، آیات ۲-۴ میں بیان کیا گیا ہے۔)

۷ — یہ اصل مقصودِ کلام ہے۔ اُوپر کے دونوں فقرے اسی تیسری بات کو ذہن نشین کرنے کے لیے بطورِ دلیل ارشاد ہوئے تھے۔

۸ — اس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے جو اصلاح نافذ کی گئی وہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے کے بجائے ان کے حقیقی باپ کی نسبت سے زیدؓ بن حارثہ کہنا شروع کر دیا گیا۔ بخاری، مسلم، ترِمذی اور نَسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زیدؓ بن حارثہ کو پہلے سب لوگ زیدؓ بن محمدؐ کہتے تھے۔ یہ آیت نازل ہونے کے بعد انھیں زیدؓ بن حارثہ کہنے لگے۔ مزید برآں اس آیت کے نُزول کے بعد یہ بات حرام قرار دے دی گئی کہ کوئی شخص اپنے حقیقی باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا نسب منسوب کرے۔ بخاری و مسلم اور ابوداؤد نے حضرت سَعدؓ بن ابی وَقّاص کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من ادعٰی الٰی غیر ابیه وهو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام۔ "جس نے اپنے آپ کو باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا، درآنحالے کہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے، اس پر جنت حرام ہے۔" اسی مضمون کی دوسری رِوایات بھی احادیث میں ملتی ہیں جن میں اس فعل کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

۹ — یعنی اس صورت میں بھی یہ درست نہ ہوگا کہ کسی شخص سے خواہ مخواہ اس کا نسب ملایا جائے۔

۱۰ — مطلب یہ ہے کہ کسی کو پیار سے بیٹا کہہ دینے میں کوئی مُضایَقہ نہیں ہے۔ اسی طرح ماں، بیٹی، بہن، بھائی وغیرہ الفاظ بھی اگر کسی کے لیے محض اخلاقاً استعمال کر لیے جائیں تو کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اس ارادے سے یہ بات کہنا کہ جسے بیٹا یا بیٹی وغیرہ کہا جائے اس کو واقعی وہی حیثیت دے دی جائے جو ان رشتوں کی ہے، اور اس کے لیے وہی حقوق ہوں جو ان رشتہ

QuranUrdu.com

وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ
اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى
بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّاۤ

اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم[11] ہے۔

بلاشُبہ نبی تو اہلِ ایمان کے لیے اُن کی اپنی ذات پر مقدّم[12] ہے، اور نبی کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں[13]، مگر کتاب اللہ کی رُو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ

داروں کے ہیں، اور اس کے ساتھ ویسے ہی تعلقات ہوں جیسے ان رشتہ داروں کے ساتھ ہوتے ہیں، یہ یقیناً قابلِ اعتراض ہے اور اس پر گرفت ہوگی۔

۱۱ - اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ پہلے اس سلسلے میں جو غلطیاں کی گئی ہیں ان کو اللہ نے معاف کیا۔ ان پر اب کوئی باز پُرس نہ ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نادانستہ افعال پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ اگر بلا ارادہ کوئی ایسی بات کی جائے جس کی ظاہری صورت ایک ممنوع فعل کی سی ہو، مگر اس میں درحقیقت اس ممنوع فعل کی نیت نہ ہو، تو محض فعل کی ظاہری شکل پر اللہ تعالیٰ سزا نہ دے ڈالے گا۔

۱۲ - یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں سے اور مسلمانوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق ہے وہ تو تمام دوسرے انسانی تعلقات سے ایک بالاتر نوعیت رکھتا ہے۔ کوئی رشتہ اُس رشتے سے اور کوئی تعلق اُس تعلق سے جو نبی اور اہلِ ایمان کے درمیان ہے، ذرّہ برابر بھی کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے ان کے ماں باپ سے بھی بڑھ کر شفیق و رحیم اور ان کی اپنی ذات سے بھی بڑھ کر خیر خواہ ہیں۔ اُن کے ماں باپ اور ان کے بیوی بچے ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، ان کے ساتھ خود غرضی برت سکتے ہیں، ان کو گمراہ کر سکتے ہیں، ان سے غلطیوں کا ارتکاب کرا سکتے ہیں، ان کو جہنّم میں دھکیل سکتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے حق میں صرف وہی بات کرنے والے ہیں جس میں اُن کی حقیقی فلاح ہو۔ وہ خود اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار سکتے ہیں، حماقتیں کر کے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر سکتے ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے لیے وہی کچھ تجویز کریں گے جو فی الواقع ان کے حق میں نافع ہو۔ اور جب معاملہ یہ ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مسلمانوں پر یہ حق ہے کہ وہ آپؐ کو اپنے ماں باپ اور اولاد اور اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھیں، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ آپؐ سے محبّت رکھیں، اپنی رائے پر آپؐ کی رائے کو اور اپنے فیصلے پر آپؐ کے فیصلے کو مُقدّم رکھیں، اور آپؐ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے جسے بخاری و مسلم وغیرہ نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے کہ لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون احبّ الیہ من والدہٖ وولدہٖ والنّاس اجمعین۔ ’’تم میں سے کوئی

QuranUrdu.com

کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اُس کو اس کے باپ اور اولاد سے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوں۔"

۱۳ – اسی خصوصیّت کی بنا پر جو اُوپر مذکور ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیّت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی منہ بولی مائیں تو کسی معنیٰ میں بھی ان کی ماں نہیں ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اُسی طرح اُن کے لیے حرام ہیں جس طرح ان کی حقیقی مائیں حرام ہیں۔ یہ مخصوص معاملہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا میں اور کسی انسان کے ساتھ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اِس معنیٰ میں اُمّہاتِ مومنین ہیں کہ ان کی تعظیم و تکریم مسلمانوں پر واجب ہے اور ان کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا تھا۔ باقی دوسرے احکام میں وہ ماں کی طرح نہیں ہیں۔ مثلاً ان کے حقیقی رشتہ داروں کے سوا باقی سب مسلمان اُن کے لیے غیر مَحرم تھے جن سے پردہ واجب تھا۔ ان کی صاحبزادیاں مسلمانوں کے لیے ماں جائی بہنیں نہ تھیں کہ ان سے بھی مسلمانوں کا نکاح ممنوع ہوتا۔ اُن کے بھائی بہن مسلمانوں کے لیے خالہ اور ماموں کے حکم میں نہ تھے۔ ان سے کسی غیر رشتہ دار مسلمان کو وہ میراث نہیں پہنچتی تھی جو ایک شخص کو اپنی ماں سے پہنچتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے یہ مرتبہ تمام ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جن میں لامحالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں۔ لیکن ایک گروہ نے جب حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد کو مرکزِ دین بنا کر سارا نظامِ دین انھی کے گرد گھما دیا، اور اس بنا پر دوسرے بہت سے صحابہؓ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کو بھی ہدفِ لعن و طعن بنایا، تو ان کی راہ میں قرآنِ مجید کی یہ آیت حائل ہوگئی جس کی رُو سے ہر اُس شخص کو انھیں اپنی ماں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایمان کا مدّعی ہو۔ آخرِ کار اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ عجیب و غریب دعویٰ کیا گیا کہ حُضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی ازواجِ مطہّراتؓ میں سے جس کو چاہیں آپؐ کی زوجیّت پر باقی رکھیں اور جسے چاہیں آپؐ کی طرف سے طلاق دے دیں۔ ابو منصور احمد بن ابو طالب طَبرسی نے کتاب الاحتجاج میں یہ بات لکھی ہے اور سلیمان بن عبداللہ البحرانی نے اسے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: یا ابا الحَسَنَ انّ هٰذا الشرف باقٍ ما دُمنا علٰی طاعة اللّٰه تعالٰی فایّتهن عصت اللّٰه تعالٰی بعدی بالخروج علیك فطلّقها من الازواج واسقطها من شرف امّهات المؤمنین (اے ابوالحسن! یہ شرف تو اسی وقت تک باقی ہے جب تک ہم لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں۔ لہٰذا میری بیویوں میں سے جو بھی میرے بعد تیرے خلاف خروج کر کے اللہ کی نافرمانی کرے اسے تو طلاق دے دیجیو اور اس کو اُمّہات المومنین کے شرف سے ساقط کر دیجیو۔)

اُصولِ رِوایت کے اعتبار سے تو یہ روایت سراسر بے اصل ہے ہی، لیکن اگر آدمی اسی سورۂ احزاب کی آیات ۲۸-۲۹ اور ۵۱-۵۲ پر غور کرے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے بھی خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ آیتِ تخییر کے بعد جن ازواجِ مطہّراتؓ نے ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رفاقت کو اپنے لیے پسند کیا تھا انھیں طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کو باقی نہ رہا تھا۔ اس مضمون کی تشریح آگے حاشیہ ۴۲ و ۹۳ میں ہم نے کر دی ہے۔

علاوہ بریں ایک غیر متعصب آدمی اگر محض عقل ہی سے کام لے کر اس روایت کے مضمون پر غور کرے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ انتہائی لَغو، اور رسولِ پاکؐ کے حق میں سخت توہین آمیز اِفترا ہے۔ رسول کا مَقام تو بہت بالاتر و برتر ہے، ایک معمولی شریف آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی وفات کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا اور دنیا سے رخصت

QuranUrdu.com

اَنۡ تَفۡعَلُوۡۤا اِلٰۤى اَوۡلِيٰٓئِكُمۡ مَّعۡرُوۡفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الۡكِتٰبِ
مَسۡطُوۡرًا ۝۶ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ
نُّوۡحٍ وَّاِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ ۖ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ
مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ۝۷ لِّيَسۡـَٔلَ الصّٰدِقِيۡنَ عَنۡ صِدۡقِهِمۡ ۚ وَاَعَدَّ

اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو۔[14] یہ حکم کتابِ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔

اور (اے نبیؐ!) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابنِ مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔[15] تاکہ سچے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے،[16] اور کافروں کے لیے

وقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو تو میری طرف سے تو اسے طلاق دے دیجیو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل البیت کی محبّت کے مدّعی ہیں ان کے دلوں میں صاحب البیت کی عزّت و ناموس کا پاس کتنا کچھ ہے، اور اس سے بھی گزر کر خود اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا وہ کتنا احترام کرتے ہیں۔

۱۴ – اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے، اُن کے ساتھ تو مسلمانوں کے تعلق کی نوعیّت سب سے الگ ہے۔ لیکن عام مسلمانوں کے درمیان آپس کے تعلقات اس اُصول پر قائم ہوں گے کہ رشتہ داروں کے حقوق ایک دوسرے پر عام لوگوں کی بہ نسبت مُقدّم ہیں۔ کوئی خیرات اس صورت میں صحیح نہیں ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ، بال بچوں، اور بھائی بہنوں کی ضروریات تو پوری نہ کرے اور باہر خیرات کرتا پھرے۔ زکوٰۃ سے بھی آدمی کو پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کی مدد کرنی ہوگی، پھر وہ دوسرے مستحقین کو دے گا۔ میراث لازماً ان لوگوں کو پہنچے گی جو رشتے میں آدمی سے قریب تر ہوں۔ دوسرے لوگوں کو اگر وہ چاہے تو ہِبہَ یا وقف یا وصیّت کے ذریعے سے اپنا مال دے سکتا ہے، مگر اس طرح نہیں کہ وارث محروم رہ جائیں اور سب کچھ دوسروں کو دے ڈالا جائے۔ اس حکمِ الٰہی سے وہ طریقہ بھی موقوف ہو گیا جو ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے سے شروع ہوا تھا، جس کی رُو سے محض دینی برادری کے تعلق کی بنا پر مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ وراثت تو رشتہ داری کی بنا پر ہی تقسیم ہوگی، البتہ ایک شخص ہدیے، تحفے یا وصیت کے ذریعے سے اپنے کسی دینی بھائی کی کوئی مدد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

۱۵ – اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ تمام انبیاؑ کی طرح آپؐ سے بھی اللہ تعالیٰ ایک پختہ عہد لے چکا ہے جس کی آپؐ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے؟ اوپر سے جو

QuranUrdu.com

سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی خود اطاعت کرے گا اور دوسروں سے کرائے گا، اللہ کی باتوں کو بے کم و کاست پہنچائے گا اور انھیں عملاً نافذ کرنے کی سعی و جُہد میں کوئی دریغ نہ کرے گا۔ قرآنِ مجید میں اس عہد کا ذکر متعدّد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (الشوریٰ، آیت ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمھارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوحؑ کو، اور جس کی وحی کی گئی (اے محمدؐ!) تمھاری طرف، اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو۔ اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں تفرقہ نہ کرو۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آلِ عمران، ۱۸۷)

اور یاد کرو اس بات کو کہ اللہ نے عہد لیا تھا اُن لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لوگ اس کی تعلیم کو بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ۔ (البقرہ، ۸۳)

اور یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ ...... خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الاعراف، آیات ۱۶۹-۱۷۱)

کیا اُن سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا؟...... مضبوطی کے ساتھ تھامو اُس چیز کو جو ہم نے تمھیں دی ہے اور یاد رکھو اس ہدایت کو جو اس میں ہے، توقع ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدہ، ۷)

اور اے مسلمانو! یاد رکھو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور اُس عہد کو جو اس نے تم سے لیا ہے جب کہ تم نے کہا: ''ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔''

اس عہد کو اس سِیاق و سَباق میں اللہ تعالیٰ جس وجہ سے یاد دلا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شَماتتِ اعدا کے اندیشے سے منہ بولے رشتوں کے معاملے میں جاہلیت کی رسم کو توڑتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ آپؐ کو بار بار یہ شرم لاحق ہو رہی تھی کہ معاملہ ایک خاتون سے شادی کرنے کا ہے۔ میں خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحِ معاشرہ کی خاطر یہ کام کروں، مگر دشمن یہی کہیں گے کہ یہ کام دراصل نفس پرستی کی خاطر کیا گیا ہے اور مُصلِح کا لبادہ اس شخص نے محض فریب دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فرما رہا ہے کہ تم ہمارے مقرر کیے ہوئے پیغمبر ہو، تمام پیغمبروں کی طرح تم سے بھی ہمارا یہ پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی حکم ہم دیں گے اس کو خود بجا لاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہٰذا تم کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہ کرو، کسی سے شرم اور خوف نہ کرو، اور جو خدمت ہم تم سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تأمّل انجام دو۔

ایک گروہ اس میثاق سے وہ میثاق مراد لیتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاؑ اور اُن کی اُمتوں سے

QuranUrdu.com

ع ٨ ١٧

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٨﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا
لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿٩﴾ ۚ اِذْ جَآءُوْكُمْ

تو اس نے دردناک عذاب مہیّا کر ہی رکھا ہے[17]۔ ع

اَے[18] لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں[19]۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔ جب وہ اُوپر سے

اس بات کے لیے لیا گیا تھا کہ وہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ اس تاویل کی بنیاد پر اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حضورؐ سے بھی یہ میثاق لیا گیا ہے کہ آپؐ کے بعد جو نبی آئے آپؐ کی اُمّت اس پر ایمان لائے گی۔ لیکن آیت کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت آئی ہے اُس میں یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ آپؐ کے بعد بھی انبیاؑ آئیں گے اور آپؐ کی اُمت کو ان پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ مفہوم اس کا لیا جائے تو یہ آیت یہاں بالکل بے جوڑ اور بے محل ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں کوئی صراحت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہاں میثاق سے کون سا میثاق مراد ہے۔ لامحالہ اس کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم کو قرآنِ مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رُجوع کرنا ہوگا جہاں انبیاؑ سے لیے ہوئے مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر سارے قرآن میں صرف ایک ہی میثاق کا ذکر ہوتا اور وہ بعد کے آنے والے انبیاؑ پر ایمان لانے کے بارے میں ہوتا تو یہ خیال کرنا دُرست ہوتا کہ یہاں بھی میثاق سے مراد وہی میثاق ہے۔ لیکن قرآنِ پاک کو جس شخص نے بھی آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے میثاقوں کا ذکر ہے جو انبیا علیہم السلام اور ان کی امتوں سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا اُن مختلف مواثیق میں سے وہ میثاق یہاں مراد لینا صحیح ہوگا جو اس سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہو، نہ کہ وہ میثاق جس کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ ہو۔ اسی طرح کی غلط تاویلوں سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ بعض لوگ قرآن سے ہدایت لینے نہیں بیٹھتے بلکہ اُسے ہدایت دینے بیٹھ جاتے ہیں۔

١٦ – یعنی اللہ تعالیٰ محض عہد لے کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس عہد کے بارے میں وہ سوال کرنے والا ہے کہ اس کی کہاں تک پابندی کی گئی۔ پھر جن لوگوں نے سچائی کے ساتھ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو وفا کیا ہوگا، وہی صادق العہد قرار پائیں گے۔

١٧ – اِس رُکوع کے مضمون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اسی سورہ کی آیات ٣٦-٤١ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔

١٨ – یہاں سے رکوع ٣ کے آخر تک کی آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی قُرَیظہ سے

QuranUrdu.com

مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ وَمِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ وَاِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ وَبَلَغَتِ
الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوۡنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابۡتُلِىَ
الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَزُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِيۡدًا ۝۱۱ وَاِذۡ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ
الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا ۝۱۲ وَ
اِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ يٰۤاَهۡلَ يَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمۡ فَارۡجِعُوۡا ۚ

اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے[20]۔ جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے مُنہ کو آ گئے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بُری طرح ہلا مارے گئے[21]۔

یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے[22] وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب اُن میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے لوگو! تمھارے لیے اب ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو[23]"

فارغ ہو چکے تھے۔ ان دونوں رُکوعوں میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قُرَیظہ کے واقعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت ان دونوں غزوات کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہییں جو ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں۔

۱۹ – یہ آندھی اُسی وقت نہیں آ گئی تھی جب کہ دشمنوں کے لشکر مدینے پر چڑھ کر آئے تھے بلکہ اُس وقت آئی تھی جب محاصرے کو تقریباً ایک مہینا گزر چکا تھا۔ نظر نہ آنے والی "فوجوں" سے مراد وہ مخفی طاقتیں ہیں جو انسانی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کام کرتی رہتی ہیں اور انسانوں کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی۔ انسان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر غیر محسوس طور پر جو قوتیں کام کرتی ہیں وہ اس کے حساب میں نہیں آتیں، حالانکہ اکثر حالات میں انھی مخفی طاقتوں کی کارفرمائی فیصلہ کُن ثابت ہوتی ہے۔ یہ طاقتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اس لیے "فوجوں" سے مراد فرشتے بھی لیے جا سکتے ہیں، اگرچہ یہاں فرشتوں کی فوجیں بھیجنے کی صراحت نہیں ہے۔

۲۰ – اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طرف سے چڑھ آئے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نجد اور خیبر سے چڑھ کر آنے والے اُوپر سے آئے، اور مکۂ معظّمہ کی طرف سے آنے والے نیچے سے آئے۔

۲۱ – ایمان لانے والوں سے مراد یہاں وہ سب لوگ ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مان کر اپنے آپ کو

QuranUrdu.com

وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَ مَا مع ۱۰
هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ
مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا

جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں"[۲۴] حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے[۲۵]، دراصل وہ (محاذِ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اُس وقت اِنھیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی[۲۶] تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انھیں شریکِ فتنہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں میں شامل کیا تھا، جن میں سچے اہلِ ایمان بھی شامل تھے اور منافقین بھی۔ اس پیراگراف میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے گروہ کا مجموعی طور پر ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد کے تین پیراگرافوں میں منافقین کی روش پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پھر آخر کے دو پیراگراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنینِ صادقین کے بارے میں ہیں۔

۲۲ – یعنی اس امر کے وعدے کہ اہلِ ایمان کو اللہ کی تائید و نصرت حاصل ہوگی اور آخر کار غلبہ انھی کو بخشا جائے گا۔

۲۳ – اس فقرے کے دو مطلب ہیں: ظاہری مطلب یہ ہے کہ خندق کے سامنے کفّار کے مقابلے پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، شہر کی طرف پلٹ چلو۔ اور باطنی مطلب یہ ہے کہ اسلام پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، اب اپنے آبائی مذہب کی طرف پلٹ جانا چاہیے تاکہ سارے عرب کی دشمنی مول لے کر ہم نے جس خطرے میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے اُس سے بچ جائیں۔ منافقین اپنی زبان سے اس طرح کی باتیں اس لیے کہتے تھے کہ جو ان کے دام میں آ سکتا ہو اس کو تو اپنا باطنی مطلب سمجھا دیں، لیکن جو ان کی بات سُن کر چوکنّا ہو اور اس پر گرفت کرے اس کے سامنے اپنے ظاہر الفاظ کی آڑ لے کر گرفت سے بچ جائیں۔

۲۴ – یعنی جب بنو قُرَیظہ بھی حملہ آوروں کے ساتھ مل گئے تو ان منافقین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر سے نکل بھاگنے کے لیے ایک اچھا بہانہ ہاتھ آ گیا اور انھوں نے یہ کہہ کر رخصت طلب کرنی شروع کی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں، لہٰذا ہمیں جا کر اپنے بال بچوں کی حفاظت کرنے کا موقع دیا جائے۔ حالانکہ اُس وقت سارے اہلِ مدینہ کی حفاظت کے ذمہ دار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بنی قُرَیظہ کی بدعہدی سے جو خطرہ بھی پیدا ہوا تھا، اُس سے شہر اور اس کے باشندوں کو بچانے کی تدبیر کرنا حضورؐ کا کام تھا نہ کہ فوج کے ایک ایک فرد کا۔

۲۵ – یعنی اس خطرے سے بچاؤ کا انتظام تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے۔ یہ انتظام بھی دفاع کی اُس مجموعی اسکیم ہی کا ایک حصّہ تھا جس پر سالارِ لشکر کی حیثیت سے حضورؐ عمل فرما رہے تھے۔ اس لیے کوئی فوری خطرہ اس وقت درپیش نہ تھا جس کی بنا پر ان کا یہ عذر کسی درجے میں بھی معقول ہوتا۔

۲۶ – یعنی اگر شہر میں داخل ہو کر فاتح کفّار اِن منافقین کو دعوت دیتے کہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ختم کر دو۔

QuranUrdu.com

بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ
الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ﴿١٥﴾ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ
اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٦﴾
قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ
اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيْرًا ﴿١٧﴾ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ
لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿١٨﴾

ہونے میں کوئی تأمُّل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پُرس تو ہونی ہی تھی[۲۷]۔

اَے نبیؐ! ان سے کہو: اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمھارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لُوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمھیں مل سکے گا[۲۸]۔ اِن سے کہو: کون ہے جو تمھیں اللہ سے بچا سکتا ہو اگر وہ تمھیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے ہیں۔

اللہ تم میں سے اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (جنگ کے کام میں) رُکاوٹیں ڈالنے والے ہیں، جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہماری طرف[۲۹]۔" جو لڑائی میں حصّہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو، جو

۲۷ – یعنی جنگِ اُحُد کے موقع پر جو کمزوری انھوں نے دکھائی تھی اس کے بعد شرمندگی و ندامت کا اظہار کر کے ان لوگوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اب اگر آزمائش کا کوئی موقع پیش آیا تو ہم اپنے اس قصور کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو محض باتوں سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جو شخص بھی اُس سے کوئی عہد باندھتا ہے اس کے سامنے کوئی نہ کوئی آزمائش کا موقع وہ ضرور لے آتا ہے تاکہ اس کا جھوٹ سچ کُھل جائے۔ اس لیے وہ جنگِ اُحُد کے دو ہی سال بعد اُس سے بھی زیادہ بڑا خطرہ سامنے لے آیا اور اُس نے جانچ کر دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے کیسا کچھ سچّا عہد اُس سے کیا تھا۔

QuranUrdu.com

اَشِحَّةً عَلَيۡكُمۡ ۚ فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ رَاَيۡتَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ
تَدُوۡرُ اَعۡيُنُهُمۡ كَالَّذِىۡ يُغۡشٰى عَلَيۡهِ مِنَ الۡمَوۡتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ
الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡكُمۡ بِاَلۡسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الۡخَيۡرِ ؕ اُولٰٓـئِكَ لَمۡ
يُؤۡمِنُوۡا فَاَحۡبَطَ اللّٰهُ اَعۡمَالَهُمۡ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۱۹﴾

تمھارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں۔[۳۰] خطرے کا وقت آ جائے تو اس طرح دِیدے پھرا پھرا کر تمھاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو، مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لیے تمھارے اِستقبال کو آ جاتے ہیں۔[۳۱] یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے، اسی لیے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیے۔[۳۲] اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔[۳۳] یہ

۲۸ – یعنی اِس فرار سے کچھ تمھاری عمر بڑھ نہیں جائے گی۔ اس کا نتیجہ بہرحال یہ نہیں ہوگا کہ تم قیامت تک جیو اور رُوئے زمین کی دولت پالو۔ بھاگ کر جیو گے بھی تو زیادہ سے زیادہ چند سال ہی جیو گے اور اُتنا ہی کچھ دنیا کی زندگی کا لطف اُٹھا سکو گے جتنا تمھارے لیے مقدّر ہے۔

۲۹ – یعنی چھوڑو اس پیغمبر کا ساتھ۔ کہاں دین و ایمان اور حق و صداقت کے چکّر میں پڑے ہو؟ اپنے آپ کو خطرات اور مصائب میں مبتلا کرنے کے بجائے وہی عافیت کوشی کی پالیسی اختیار کرو جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔

۳۰ – یعنی اپنی محنتیں، اپنے اوقات، اپنی فکر، اپنے مال، غَرض کوئی چیز بھی وہ اُس راہ میں صَرف کرنے کے لیے بخوشی تیار نہیں ہیں جس میں مومنینِ صادقین اپنا سب کچھ جھونکے دے رہے ہیں۔ جان کھپانا اور خطرے انگیز کرنا تو بڑی چیز ہے، وہ کسی کام میں بھی کھُلے دل سے اہلِ ایمان کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔

۳۱ – لغت کے اعتبار سے اس آیت کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ لڑائی سے جب تم کامیاب پلٹتے ہو تو وہ بڑے تپاک سے تمھارا استقبال کرتے ہیں اور چرب زبانی سے کام لے کر یہ دھونس جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی بڑے مومن ہیں اور ہم نے بھی اس کام کو فروغ دینے میں حصّہ لیا ہے، لہٰذا ہم بھی مالِ غنیمت کے حق دار ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر فتح نصیب ہوتی ہے تو مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر یہ لوگ زبان کی بڑی تیزی دکھاتے ہیں اور بڑھ بڑھ کر مطالبے کرتے ہیں کہ لاؤ ہمارا حصّہ، ہم نے بھی خدمات انجام دی ہیں، سب کچھ تم ہی لوگ نہ لُوٹ لے جاؤ۔

۳۲ – یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد جو نمازیں انھوں نے پڑھیں، جو روزے رکھے، جو زکوتیں دیں، اور بظاہر جو نیک کام بھی کیے ان سب کو اللہ تعالیٰ کالعدم قرار دے دے گا اور ان کا کوئی اجر انھیں نہ دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فیصلہ اعمال کی ظاہری

QuranUrdu.com

يَحْسَبُونَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ
اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ۖ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا
قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲۰﴾ ع لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ

ع ۲ ۱۸

سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اُس موقع پر یہ کہیں صحرا میں بدّوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمھارے حالات پُوچھتے رہیں۔ تاہم اگر یہ تمھارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصّہ لیں گے۔ ع
درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا[۳۴]، ہر اُس شخص کے لیے

شکل پر نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس ظاہر کی تہ میں ایمان اور خلوص ہے یا نہیں۔ جب یہ چیز سرے سے ان کے اندر موجود ہی نہیں ہے تو یہ دکھاوے کے اعمال سراسر بے معنیٰ ہیں۔ اِس مقام پر یہ امر گہری توجہ کا طالب ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کا اقرار کرتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، زکوٰۃ بھی دیتے تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوسرے نیک کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے، ان کے بارے میں صاف صاف فیصلہ دے دیا گیا ہے کہ یہ سرے سے ایمان لائے ہی نہیں۔ اور یہ فیصلہ صرف اس بنیاد پر دیا گیا ہے کہ کفر اور اسلام کی کشمکش میں جب کڑی آزمایش کا وقت آیا تو انھوں نے دوغلے پن کا ثبوت دیا، دین کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دی اور اسلام کی حفاظت کے لیے جان، مال اور محنت صَرف کرنے میں دریغ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فیصلے کا اصل مدار یہ ظاہری اعمال نہیں ہیں، بلکہ یہ سوال ہے کہ آدمی کی وفاداریاں کس طرف ہیں۔ جہاں خدا اور اس کے دین سے وفاداری نہیں ہے، وہاں اقرارِ ایمان اور عبادات اور دوسری نیکیوں کی کوئی قیمت نہیں۔

۳۳- یعنی اِن کے اعمال کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتے کہ ان کو ضائع کر دینا اللہ کو گراں گزرے۔ اور یہ لوگ کوئی زور بھی نہیں رکھتے کہ ان کے اعمال کو ضائع کرنا اُس کے لیے دشوار ہو۔

۳۴- جس سیاق وسباق میں یہ آیت ارشاد ہوئی ہے اس کے لحاظ سے رسولِ پاکؐ کے طرزِ عمل کو اس جگہ نمونے کے طور پر پیش کرنے سے مقصود اُن لوگوں کو سبق دینا تھا جنھوں نے جنگِ احزاب کے موقع پر مفاد پرستی و عافیت کوشی سے کام لیا تھا۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم ایمان واسلام اور اتباعِ رسولؐ کے مدّعی تھے۔ تم کو دیکھنا چاہیے تھا کہ جس رسول کے پیروؤں میں تم شامل ہوئے ہو اُس کا اس موقع پر کیا رَوِیّہ تھا۔ اگر کسی گروہ کا لیڈر خود عافیت کوش ہو، خود آرام طلب ہو، خود اپنے ذاتی مفاد کی حفاظت کو مقدّم رکھتا ہو، خطرے کے وقت خود بھاگ نکلنے کی تیاریاں کر رہا ہو، پھر تو اس کے پیروؤں کی طرف سے اِن کمزوریوں کا اظہار معقول ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ ہر مَشقّت جس کا آپؐ نے دوسروں سے مطالبہ کیا، اسے برداشت کرنے میں آپؐ خود سب کے ساتھ شریک تھے، بلکہ دوسروں سے بڑھ کر ہی آپؐ نے حصہ لیا۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اُٹھائی ہو اور آپؐ نے

QuranUrdu.com

كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَ لَمَّا رَاَ
الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ
اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔[۳۵] اور سچے مومنوں (کا حال اُس وقت یہ تھا کہ)[۳۶] جب انھوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔"[۳۷] اس واقعے نے اُن کے ایمان اور ان کی سُپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔[۳۸] ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ

نہ اٹھائی ہو۔ خندق کھودنے والوں میں آپؐ خود شامل تھے۔ بھوک اور سردی کی تکلیفیں اٹھانے میں ایک ادنیٰ مسلمان کے ساتھ آپؐ کا حصّہ بالکل برابر کا تھا۔ محاصرے کے دَوران میں آپؐ ہر وقت محاذِ جنگ پر موجود رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی دشمن کے مقابلے سے نہ ہٹے۔ بنی قُرَیظہ کی غدّاری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے بال بچّے مبتلا تھے اُسی میں آپؐ کے بال بچے بھی مبتلا تھے۔ آپؐ نے اپنی حفاظت اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کے لیے کوئی خاص اہتمام نہ کیا جو دوسرے مسلمانوں کے لیے نہ ہو۔ جس مقصدِ عظیم کے لیے آپؐ دوسروں سے قربانیوں کا مطالبہ کر رہے تھے اس پر سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر آپؐ خود اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے۔ اس لیے جو کوئی بھی آپؐ کے اتباع کا مدّعی تھا، اسے یہ نمونہ دیکھ کر اس کی پیروی کرنی چاہیے تھی۔

یہ تو موقع و محل کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم ہے۔ مگر اس کے الفاظ عام ہیں اور اس کے منشا کو صرف اسی معنیٰ تک محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ صرف اسی لحاظ سے اُس کے رسول کی زندگی مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے، بلکہ مطلقاً اسے نمونہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ہر معاملے میں آپؐ کی زندگی کو اپنے لیے نمونے کی زندگی سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و کردار کو ڈھالیں۔

۳۵- یعنی اللہ سے غافل آدمی کے لیے تو یہ زندگی نمونہ نہیں ہے مگر اس شخص کے لیے ضرور نمونہ ہے جو کبھی کبھار اتفاقاً خدا کا نام لے لینے والا نہیں بلکہ کثرت سے اس کو یاد کرنے اور یاد رکھنے والا ہو۔ اسی طرح یہ زندگی اُس شخص کے لیے تو نمونہ نہیں ہے جو اللہ سے کوئی اُمّید اور آخرت کے آنے کی کوئی توقع نہ رکھتا ہو، مگر اُس شخص کے لیے ضرور نمونہ ہے جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا اُمیدوار ہو اور جسے یہ بھی خیال ہو کہ کوئی آخرت آنے والی ہے جہاں اس کی بھلائی کا سارا انحصار ہی اس پر ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کا رویّہ رسولِ خداؐ کے رویّے سے کس حد تک قریب تر رہا ہے۔

۳۶- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ صحابۂ کرامؓ کے طرزِ عمل کو نمونے کے طور پر پیش فرماتا ہے تاکہ ایمان کے جھوٹے مدعیوں اور سچے دل سے رسول کی پیروی اختیار کرنے والوں کا کردار ایک دوسرے کے

QuranUrdu.com

مقابلے میں پوری طرح نمایاں کر دیا جائے۔ اگرچہ ظاہری اقرارِ ایمان میں وہ اور یہ یکساں تھے۔ مسلمانوں کے گروہ میں دونوں کا شمار ہوتا تھا اور نمازوں میں دونوں شریک ہوتے تھے۔ لیکن آزمائش کی گھڑی پیش آنے پر دونوں ایک دوسرے سے چھٹ کر الگ ہو گئے اور صاف معلوم ہو گیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مخلص وفادار کون ہیں اور محض نام کے مسلمان کون۔

۳۷– اس موقع پر آیت نمبر ۱۲ کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ وہاں بتایا گیا تھا کہ جو لوگ منافق اور دل کے روگی تھے انھوں نے دس بارہ ہزار کے لشکر کو سامنے سے اور بنی قُرَیظَہ کو پیچھے سے حملہ آور ہوتے دیکھا تو پکار پکار کر کہنے لگے کہ ”سارے وعدے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے کیے تھے محض جھوٹ اور فریب نکلے۔ کہا تو ہم سے یہ گیا تھا کہ دینِ خدا پر ایمان لاؤ گے تو خدا کی تائید تمھاری پشت پر ہو گی، عرب و عجم پر تمھارا سکّہ رَواں ہو گا، اور قیصر و کِسریٰ کے خزانے تمھارے لیے کُھل جائیں گے۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ سارا عرب ہمیں مٹا دینے پر تُل گیا ہے اور کہیں سے فرشتوں کی وہ فوجیں آتی نظر نہیں آ رہیں جو ہمیں اس سیلابِ بلا سے بچا لیں۔“ اب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے وعدوں کا ایک مطلب تو وہ تھا جو اُن جھُوٹے مدّعیانِ ایمان نے سمجھا تھا۔ دوسرا مفہوم وہ ہے جو اِن صادق الایمان مسلمانوں نے سمجھا۔ خطرات اُمنڈتے دیکھ کر اللہ کے وعدے تو ان کو بھی یاد آئے، مگر یہ وعدے نہیں کہ ایمان لاتے ہی انگلی ہلائے بغیر تم دنیا کے فرماں روا ہو جاؤ گے اور فرشتے آ کر تمھاری تاج پوشی کی رسم ادا کریں گے، بلکہ یہ وعدے کہ سخت آزمایشوں سے تم کو گزرنا ہو گا، مصائب کے پہاڑ تم پر ٹوٹ پڑیں گے، گراں ترین قربانیاں تمھیں دینی ہوں گی، تب کہیں جا کر اللہ کی عنایات تم پر ہوں گی اور تمھیں دنیا اور آخرت کی وہ سرفرازیاں بخشی جائیں گی جن کا وعدہ اللہ نے اپنے مومن بندوں سے کیا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ (البقرہ: آیت ۲۱۴)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں بس یونہی داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی وہ حالات تو تم پر گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی پکار اُٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد ـــ سنو اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یہ کہنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے کہ ”ہم ایمان لائے“ اور انھیں آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم نے اُن سب لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

۳۸– یعنی اس سیلابِ بلا کو دیکھ کر ان کے ایمان مُتزلزل ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئے، اور اللہ کی فرماں برداری سے بھاگ نکلنے کے بجائے وہ اور زیادہ یقین و اطمینان کے ساتھ اپنا سب کچھ اُس کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔

اس مَقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان و تسلیم دراصل نفس کی ایک ایسی کیفیت ہے جو دین کے ہر حکم اور ہر مطالبے پر امتحان میں پڑ جاتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں ہر ہر قدم پر آدمی کے سامنے وہ مواقع آتے ہیں جہاں دین یا تو کسی چیز کا حکم دیتا ہے، یا کسی چیز سے منع کرتا ہے، یا جان اور مال اور وقت اور محنت اور خواہشاتِ نفس کی قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایسے ہر موقع پر جو

QuranUrdu.com

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ ﴿٢٤﴾ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ
يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا

موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچّا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے[٣٩]۔ انھوں نے اپنے رِویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ سچّوں کو اُن کی سچّائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے، اور چاہے تو اُن کی توبہ قبول کر لے، بے شک اللہ غفُور و رحیم ہے۔

اللہ نے کفّار کا مُنہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یُونہی پلٹ گئے، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور

شخص اطاعت سے انحراف کرے گا اُس کے ایمان و تسلیم میں کمی واقع ہو گی، اور جو شخص بھی حکم کے آگے سر جھکا دے گا اس کے ایمان و تسلیم میں اضافہ ہو گا۔ اگرچہ ابتداءً آدمی صرف کلِمۂ اسلام کو قُبول کر لینے سے مومن و مسلم ہو جاتا ہے، لیکن یہ کوئی ساکن و جامد حالت نہیں ہے جو بس ایک ہی مقام پر ٹھیری رہتی ہو، بلکہ اس میں تنزُّل اور ارتقا دونوں کے امکانات ہیں۔ خلوص اور اطاعت میں کمی اس کے تنزُّل کی موجب ہوتی ہے، یہاں تک کہ ایک شخص پیچھے ہٹتے ہٹتے ایمان کی اس آخری سرحد پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے یک سرِ مُو بھی تجاوز کر جائے تو مومن کے بجائے منافق ہو جائے۔ اس کے برعکس خلوص جتنا زیادہ ہو، اطاعت جتنی مکمل ہو اور دینِ حق کی سربلندی کے لیے لگن اور دُھن جتنی بڑھتی چلی جائے، ایمان اُسی نسبت سے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی صدیقیت کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ کمی و بیشی جو کچھ بھی ہے اَخلاقی مراتب میں ہے جس کا حساب اللہ کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا۔ بندوں کے لیے ایمان بس ایک ہی اقرار و تصدیق ہے جس سے ہر مسلمان داخلِ اسلام ہوتا ہے اور جب تک اس پر قائم رہے، مسلمان مانا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ آدھا مسلمان ہے اور یہ پاؤ، یا یہ دوگُنا مسلمان ہے اور یہ تین گُنا۔ اسی طرح قانونی حُقوق میں سب مسلمان یکساں ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو ہم زیادہ مومن کہیں اور اس کے حقوق زیادہ ہوں، اور کسی کو کم مومن قرار دیں اور اس کے حقوق کم ہوں۔ اِن اعتبارات سے ایمان کی کمی و بیشی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور دراصل اسی معنیٰ میں امام ابو حنیفہؒ نے یہ فرمایا ہے کہ الایمان لایزید ولاینقص، ”ایمان کم و بیش نہیں ہوتا۔“ (مزید

QuranUrdu.com

عَزِيزًا ﴿٢٥﴾ وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ
وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿٢٦﴾
وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ
اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٧﴾ ع يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ ع ۳ ۱۹
تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا
جَمِيلًا ﴿٢٨﴾ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ

زبردست ہے۔ پھر اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا،[۴۰] اللہ اُن کی گڑھیوں سے انھیں اُتار لایا اور اُن کے دلوں میں اُس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو۔ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمھیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ع

اے نبیؐ![۴۱] اپنی بیویوں سے کہو: اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ

تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۲، الانفال، حاشیہ ۲۔ جلد پنجم، الفتح، حاشیہ ۷)

۳۹ — یعنی کوئی اللہ کی راہ میں جان دے چکا ہے اور کوئی اس کے لیے تیار ہے کہ وقت آئے تو اس کے دین کی خاطر اپنے خون کا نذرانہ پیش کر دے۔

۴۰ — یعنی یہودِ بنی قُرَیظہ۔

۴۱ — یہاں سے نمبر ۳۵ تک کی آیات جنگِ احزاب اور بنی قُرَیظہ سے مُتّصل زمانے میں نازل ہوئی تھیں۔ ان کا پَس منظر ہم دیباچے میں مختصراً بیان کر آئے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ اُس زمانے کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ آپؐ کی ازواج آپؐ کے گرد بیٹھی ہیں اور آپؐ خاموش ہیں۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا: ”هُنَّ كَمَا تَرَى يَسْأَلْنَنِي النفقة، “یہ میرے گرد بیٹھی ہیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ یہ مجھ سے خرچ کے لیے روپیا مانگ رہی ہیں۔” اس پر دونوں صاحبوں نے اپنی اپنی بیٹیوں کو ڈانٹا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرتی ہو اور وہ چیز مانگتی ہو جو آپؐ کے پاس نہیں ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اس وقت کیسی مالی مشکلات میں مبتلا تھے اور کفر و اسلام کی

QuranUrdu.com

فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

تم میں سے جو نیکوکار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔[۴۲]

انتہائی شدید کش مکش کے زمانے میں خرچ کے لیے ازواجِ مطہّراتؓ کے تقاضے مزاجِ مبارک پر کیا اثر ڈال رہے تھے۔

۴۲- اس آیت کے نُزول کے وقت حضورؐ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں: حضرت سَودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حَفصہ اور حضرت اُمّ سَلَمہؓ۔ ابھی حضرت زینبؓ سے حضورؐ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ (احکام القرآن لابنُ العَرَبی، طبع مصر ۱۹۵۸ء، جلد ۳، ص ۱۳-۱۵۱۲) جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی اور فرمایا: ”میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، اپنے والدین کی رائے لو، پھر فیصلہ کرو۔“ پھر حضورؐ نے ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آیا ہے، اور یہ آیت ان کو سنا دی۔ انھوں نے عرض کیا: ”کیا اس معاملے کو میں اپنے والدین سے پوچھوں؟ میں تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو چاہتی ہوں۔“ اس کے بعد حضورؐ باقی ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک ایک کے ہاں گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی، اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔ (مُسْنَدِ احمد، مسلم، نَسائی)

اِصْطِلاح میں اس کو تَخْیِیر کہتے ہیں، یعنی بیوی کو اس امر کا اختیار دینا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے یا اس سے جدا ہو جانے کے درمیان کسی ایک چیز کا خود فیصلہ کرلے۔ یہ تَخْیِیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حضورؐ کو حکم دیا تھا۔ اگر ازواجِ مطہراتؓ میں سے کوئی خاتون عَلیحدَگی کا پہلو اختیار کرتیں تو آپ سے آپ جدا نہ ہو جاتیں بلکہ حضورؐ کے جدا کرنے سے ہوتیں، جیسا کہ آیت کے الفاظ ”آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کردوں“ سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن حضورؐ پر یہ واجب تھا کہ اس صورت میں ان کو جدا کر دیتے، کیونکہ نبی کی حیثیت سے آپؐ کا یہ منصب نہ تھا کہ اپنا وعدہ پورا نہ فرماتے۔ جدا ہو جانے کے بعد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُمّہات المومنین کے زُمرے سے خارج ہو جاتیں اور ان سے کسی دوسرے مسلمان کا نکاح حرام نہ ہوتا، کیونکہ وہ دنیا اور اس کی زینت ہی کے لیے تو رسولِ پاکؐ سے عَلیحدَگی اختیار کرتیں جس کا حق انھیں دیا گیا تھا، اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ مقصد نکاح سے محروم ہو جانے کی صورت میں پورا نہ ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف آیت کا منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن ازواج نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو پسند کر لیا انھیں طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کے لیے باقی نہ رہا، کیونکہ تَخْیِیر کے دو ہی پہلو تھے: ایک، یہ کہ دنیا کو اختیار کرتی ہو تو تمھیں جدا کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو اختیار کرتی ہو تو تمھیں جدا نہ کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ ان میں سے جو پہلو بھی کوئی خاتون اختیار کرتیں، ان کے حق میں دوسرا پہلو آپ سے آپ ممنوع ہو جاتا تھا۔

اسلامی فِقہ میں تَخْیِیر دراصل تفویضِ طلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی شوہر اس ذریعے سے بیوی کو اختیار دے دیتا ہے کہ چاہے تو اس کے نکاح میں رہے ورنہ الگ ہو جائے۔ اس مسئلے میں قرآن و سنت سے اِستِنباط کر کے فقہا نے جو احکام بیان کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) یہ اختیار ایک دفعہ عورت کو دے دینے کے بعد شوہر نہ تو اسے واپس لے سکتا ہے اور نہ عورت کو اُس کے استعمال سے روک سکتا ہے۔ البتہ عورت کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اس اختیار کو استعمال ہی کرے۔ وہ چاہے تو شوہر کے ساتھ رہنے پر رضامندی

QuranUrdu.com

ظاہر کردے، چاہے علیحدگی کا اعلان کردے، اور چاہے تو کسی چیز کا اظہار نہ کرے اور اس اختیار کو یونہی ضائع ہو جانے دے۔

(۲) اس اختیار کے عورت کی طرف منتقل ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ اوّل، یہ کہ شوہر نے یا تو اسے صریح الفاظ میں طلاق کا اختیار دیا ہو، یا اگر طلاق کی تصریح نہ کی ہو تو پھر اس کی نیت یہ اختیار دینے کی ہو۔ مثلاً اگر وہ کہے: ''تجھے اختیار ہے''، یا ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے''، تو اس طرح کے کِنایات میں شوہر کی نیت کے بغیر طلاق کا اختیار عورت کی طرف منتقل نہ ہوگا۔ اگر عورت اس کا دعویٰ کرے اور شوہر بحلف یہ بیان دے کہ اس کی نیت طلاق کا اختیار دینے کی نہ تھی تو شوہر کا بیان قبول کیا جائے گا۔ اِلّا یہ کہ عورت اس امر کی شہادت پیش کر دے کہ یہ الفاظ ناچاقی اور جھگڑے کی حالت میں، یا طلاق کی باتیں کرتے ہوئے کہے گئے تھے، کیونکہ اس سِیاق وسَباق میں اختیار دینے کے معنیٰ یہی سمجھے جائیں گے کہ شوہر کی نیت طلاق کا اختیار دینے کی تھی۔ دوم، یہ کہ عورت کو معلوم ہو کہ یہ اختیار اسے دیا گیا ہے۔ اگر وہ غائب ہو تو اُسے اس کی اطلاع ملنی چاہیے، اور اگر وہ موجود ہو تو اسے یہ الفاظ سننے چاہییں۔ جب تک وہ سنے نہیں، یا اسے اس کی خبر نہ پہنچے، اختیار اس کی طرف منتقل نہ ہوگا۔

(۳) اگر شوہر کسی وقت کی تعیین کے بغیر مُطلَقاً اس کو اختیار دے تو عورت اس اختیار کو کب تک استعمال کر سکتی ہے؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس نِشَست میں شوہر اس سے یہ بات کہے اُسی نِشَست میں عورت اپنا اختیار استعمال کر سکتی ہے۔ اگر وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے اُٹھ جائے، یا کسی ایسے کام میں مشغول ہو جائے جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ وہ جواب نہیں دینا چاہتی، تو اس کا اختیار باطل ہو جائے گا۔ یہ رائے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابنِ مسعودؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، جابر بن زید، عطاؒ، مجاہدؒ، شَعْبیؒ، نَخَعیؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام اَوزاعیؒ، سُفیان ثَوریؒ اور ابوثَورؒ کی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا اختیار اس نِشَست تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس کے بعد بھی اسے استعمال کر سکتی ہے۔ یہ رائے حضرت حَسَن بصریؒ، قَتَادَہؒ اور زُہریؒ کی ہے۔

(۴) اگر شوہر وقت کی تعیین کر دے، مثلاً کہے کہ ایک مہینے یا ایک سال تک تجھے اختیار ہے، یا اتنی مدت تک تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو یہ اختیار اسی مدّت تک اس کو حاصل رہے گا۔ البتہ اگر وہ کہے کہ تو جب چاہے اس اختیار کو استعمال کر سکتی ہے، تو اس صورت میں اس کا اختیار غیر محدود ہوگا۔

(۵) عورت اگر علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو اسے واضح اور قطعی الفاظ میں اس کا اظہار کرنا چاہیے۔ مبہم الفاظ جن سے مدّعا واضح نہ ہوتا ہو، مؤثّر نہیں ہو سکتے۔

(۶) قانوناً شوہر کی طرف سے عورت کو اختیار دینے کے تین صیغے ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ کہے ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے۔'' دوسرے، یہ کہ وہ کہے ''تجھے اختیار ہے۔'' تیسرے، یہ کہ وہ کہے ''تجھے طلاق ہے اگر تُو چاہے۔'' ان میں سے ہر ایک کے قانونی نتائج الگ الگ ہیں:

الف: ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے'' کے الفاظ اگر شوہر نے کہے ہوں اور عورت اس کے جواب میں کوئی صریح بات ایسی کہے جس سے ظاہر ہو کہ وہ علیحدگی اختیار کرتی ہے، تو حَنَفِیّہ کے نزدیک ایک طلاق بائن پڑ جائے گی۔ (یعنی اس کے بعد شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا، لیکن عدّت گزر جانے پر یہ دونوں پھر چاہیں تو باہم نکاح کر سکتے ہیں۔) اور اگر شوہر نے کہا ہو کہ ''ایک طلاق کی حد تک تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے'' تو اس صورت میں ایک طلاق رَجعی پڑے گی۔ (یعنی عدّت کے اندر شوہر رجوع کر سکتا ہے۔) لیکن

QuranUrdu.com

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا
الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾
وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ الجزء ۲۲
اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ
لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ

نبیؐ کی بیویو! تم میں سے جو کسی صریح فُحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دُہرا عذاب دیا جائے گا،[43] اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے[44]۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی، اس کو ہم دُہرا اجر دیں[45] گے اور ہم نے اس کے لیے رزقِ کریم مہیّا کر رکھا ہے۔

نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو[46]۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے

اگر شوہر نے معاملہ عورت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تین طلاق کی نیت کی ہو، یا اس کی تصریح کی ہو تو اس صورت میں عورت کا اختیارِ طلاق ہی کا ہم معنیٰ ہوگا، خواہ وہ بصراحت اپنے اُوپر تین طلاق وارد کرے یا صرف ایک بار کہے کہ میں نے عَلیٰحدَگی اختیار کی یا اپنے آپ کو طلاق دی۔

ب: ”تجھے اختیار ہے“ کے الفاظ کے ساتھ اگر شوہر نے عورت کو علیٰحدگی کا اختیار دیا ہو اور عورت علیٰحدگی اختیار کرنے کی تصریح کر دے تو حَنفِیّہ کے نزدیک ایک ہی طلاق بائن پڑے گی خواہ شوہر کی نیت تین طلاق کا اختیار دینے کی ہو، البتہ اگر شوہر کی طرف سے تین طلاق کا اختیار دینے کی تصریح ہو، تب عورت کے اختیارِ طلاق سے تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر شوہر نے اختیار دیتے ہوئے طلاق کی نیت کی ہو اور عورت علیٰحدگی اختیار کرے تو ایک طلاق رَجعی واقع ہوگی۔ امام مالکؒ کے نزدیک مدخولہ بیوی پر تین طلاقیں پڑ جائیں گی لیکن اگر غیر مدخولہ کے معاملے میں شوہر ایک طلاق کی نیت کا دعویٰ کرے تو اسے قبول کر لیا جائے گا۔

ج: ”تجھے طلاق ہے اگر تُو چاہے“ کہنے کی صورت میں اگر عورت طلاق کا اختیار استعمال کرے تو طلاق رَجعی ہو گی نہ کہ بائن۔

(۷) اگر مرد کی طرف سے علیٰحدگی کا اختیار دیے جانے کے بعد عورت اسی کی بیوی بن کر رہنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دے تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ یہی رائے حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عائشہؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، ابنِ عباسؓ اور ابنِ عمرؓ

QuranUrdu.com

کی ہے، اور اسی رائے کو جُمہور فقہا نے اختیار کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مَسرُوقؒ نے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا: خیّر رسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نساءَہ فاخترنہ اکان ذٰلك طلاقًا؟ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو اختیار دیا تھا اور انھوں نے حضورؐ ہی کے ساتھ رہنا پسند کر لیا تھا، پھر کیا اسے طلاق شمار کیا گیا؟" اس معاملے میں صرف حضرت علیؓ اور زیدؓ بن ثابت کی یہ رائے منقول ہوئی ہے کہ ایک طلاق رَجعی واقع ہو گی۔ لیکن دوسری رِوایت ان دونوں بزرگوں سے بھی یہی ہے کہ کوئی طلاق واقع نہ ہو گی۔

۴۳ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نعوذ باللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ سے کسی فُحش حرکت کا اندیشہ تھا۔ بلکہ اس سے مقصود حضورؐ کی ازواج کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسلامی معاشرے میں ان کا مقام جس قدر بلند ہے اسی کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت سخت ہیں، اس لیے ان کا اَخلاقی رَوِیّہ انتہائی پاکیزہ ہونا چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ "اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا۔" (الزُّمَر، آیت ۶۵) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! حضورؐ سے شرک کا کوئی اندیشہ تھا، بلکہ اس سے مقصود حضورؐ کو اور آپؐ کے واسطے سے عام انسانوں کو یہ احساس دلانا تھا کہ شرک کتنا خطرناک جرم ہے جس سے سخت اِحتراز لازم ہے۔

۴۴ – یعنی تم اس بُھلاوے میں نہ رہنا کہ نبی کی بیویاں ہونا تمھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکتا ہے، یا تمھارے مرتبے کچھ ایسے بلند ہیں کہ اُن کی وجہ سے تمھیں پکڑنے میں اللہ کو کوئی دشواری پیش آ سکتی ہے۔

۴۵ – گناہ پر دُہرے عذاب اور نیکی پر دُہرے اجر کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ انسانی معاشرے میں کسی بلند مرتبے پر سرفراز فرماتا ہے وہ بالعُموم لوگوں کے رہنما بن جاتے ہیں اور بندگانِ خدا کی بڑی تعداد بھلائی اور برائی میں انھی کی پیروی کرتی ہے۔ ان کی برائی تنہا انھی کی برائی نہیں ہوتی بلکہ ایک قوم کے بگاڑ کی موجب بھی ہوتی ہے اور ان کی بھلائی صرف انھی کی انفرادی بھلائی نہیں ہوتی بلکہ بہت سے انسانوں کی فلاح کا سبب بھی بنتی ہے۔ اس لیے جب وہ بُرے کام کرتے ہیں تو اپنے بگاڑ کے ساتھ دوسروں کے بگاڑ کی بھی سزا پاتے ہیں۔ اور جب وہ نیک کام کرتے ہیں تو انھیں اپنی نیکی کے ساتھ اس بات کی جزا بھی ملتی ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بھلائی کی راہ دکھائی۔

اس آیت سے یہ اُصول بھی نکلتا ہے کہ جہاں جتنی زیادہ حرمت ہو گی اور جس قدر زیادہ امانت کی توقع ہو گی، وہاں اسی قدر زیادہ ہتکِ حرمت اور ارتکابِ خیانت کا جرم شدید ہو گا اور اسی قدر زیادہ اس کا عذاب سخت ہو گا۔ مثلاً مسجد میں شراب پینا اپنے گھر میں شراب پینے سے شدید تر جرم ہے اور اس کی سزا زیادہ سخت ہے۔ مُحرّمات سے زِنا کرنا غیر عورت سے زِنا کی بہ نسبت اشدّ ہے اور اس پر زیادہ سخت عذاب ہو گا۔

۴۶ – یہاں سے آخر پیرگراف تک کی آیات وہ ہیں جن سے اسلام میں پردے کے احکام کا آغاز ہوا ہے۔ اِن آیات میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے کیا گیا ہے مگر مقصود تمام مسلمان گھروں میں اِن اصلاحات کو نافذ کرنا ہے۔ ازواجِ مطہراتؓ کو مخاطَب کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے اس پاکیزہ طرزِ زندگی کی ابتدا ہو گی تو باقی سارے مسلمان گھرانوں کی خواتین خود اس کی تقلید کریں گی، کیونکہ یہی گھر اُن کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعض لوگ صرف اس بنیاد پر کہ ان آیات کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ سے ہے، یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ یہ احکام انھی کے لیے خاص ہیں۔ لیکن آگے ان آیات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ کون سی بات ایسی ہے جو حضورؐ کی ازواج کے لیے خاص ہو اور باقی مسلمان عورتوں کے لیے مطلوب نہ ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ کا

QuranUrdu.com

بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔[۴۷]

منشا یہی ہوسکتا تھا کہ صرف ازواجِ مطہراتؓ ہی گندگی سے پاک ہوں، اور وہی اللہ و رسولؐ کی اطاعت کریں، اور وہی نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں؟ اگر یہ منشا نہیں ہوسکتا تو پھر گھروں میں چین سے بیٹھنے اور تبرُّجِ جاہلیت سے پرہیز کرنے اور غیر مردوں کے ساتھ دبی زبان سے بات نہ کرنے کا حکم ان کے لیے کیسے خاص ہوسکتا ہے اور باقی مسلمان عورتیں اس سے مستثنیٰ کیسے ہوسکتی ہیں؟ کیا کوئی معقول دلیل ایسی ہے جس کی بنا پر ایک ہی سلسلۂ کلام کے مجموعی احکام میں سے بعض کو عام اور بعض کو خاص قرار دیا جائے؟

رہا یہ فقرہ کہ ''تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو'' تو اس سے بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ عام عورتوں کو تو بن ٹھن کر نکلنا چاہیے اور غیر مردوں سے خوب لگاوٹ کی باتیں کرنی چاہییں، البتہ تم ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرو۔ بلکہ اس کے برعکس یہ طرزِ کلام کچھ اس طرح کا ہے جیسے ایک شریف آدمی اپنے بچّے سے کہتا ہے کہ ''تم بازاری بچوں کی طرح نہیں ہو، تمھیں گالی نہ بکنی چاہیے۔'' اس سے کوئی عقل مند آدمی بھی کہنے والے کا یہ مدّعا اخذ نہ کرے گا کہ وہ صرف اپنے بچّے کے لیے گالیاں بکنے کو بُرا سمجھتا ہے، دوسرے بچوں میں یہ عیب موجود رہے تو اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

۴۷ — یعنی ضرورت پیش آنے پر کسی مرد سے بات کرنے میں مُضایَقہ نہیں ہے، لیکن ایسے مواقع پر عورت کا لہجہ اور اندازِ گفتگو ایسا ہونا چاہیے جس سے بات کرنے والے مرد کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ گزر سکے کہ اس عورت سے کوئی اور توقع بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ اُس کے لہجے میں کوئی لوچ نہ ہو، اس کی باتوں میں کوئی لگاوٹ نہ ہو، اس کی آواز میں دانستہ کوئی شیرینی گُھلی ہوئی نہ ہو جو سننے والے مرد کے جذبات میں انگیخت پیدا کردے اور اسے آگے قدم بڑھانے کی ہمّت دلائے۔ اس طرزِ گفتگو کے متعلق اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ یہ کسی ایسی عورت کو زیب نہیں دیتا جس کے دل میں خدا کا خوف اور بدی سے پرہیز کا جذبہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ فاسقات و فاجرات کا طرزِ کلام ہے نہ کہ مومناتِ مُتّقیات کا۔ اس کے ساتھ اگر سورۂ نور کی وہ آیت بھی دیکھی جائے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (اور وہ زمین پر اس طرح پاؤں مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے اس کا علم لوگوں کو ہو) تو ربّ العالمین کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں خواہ مخواہ اپنی آواز یا اپنے زیوروں کی جھنکار غیر مردوں کو نہ سنائیں اور اگر بضرورت اجنبیوں سے بولنا پڑ جائے تو پوری احتیاط کے ساتھ بات کریں۔ اسی بنا پر عورت کے لیے اذان دینا ممنوع ہے۔ نیز اگر نمازِ باجماعت میں کوئی عورت موجود ہو اور امام کوئی غَلَطی کرے تو مرد کی طرح سبحان اللہ کہنے کی اسے اجازت نہیں ہے بلکہ اس کو صرف ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنی چاہیے تاکہ امام مُتنبّہ ہو جائے۔

اب یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلا ضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے، کیا وہ کبھی اس کو پسند کرسکتا ہے کہ عورت اسٹیج پر آکر گائے، ناچے، تھرکے، بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سُریلے نغموں کے ساتھ فُحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں

QuranUrdu.com

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ

اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو[۴۸] اور سابق دَورِ جاہلیّت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو[۴۹]۔ نماز قائم کرو،

کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (air-hostess) بنائی جائیں اور انھیں خاص طور پر مسافروں کا دل لُبھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بَن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گُھل مِل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے برآمد کی گئی ہے؟ خدا کا نازل کردہ قرآن تو سب کے سامنے ہے۔ اس میں کہیں اس کلچر کی گنجایش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشان دِہی کر دی جائے۔

۴۸- اصل میں لفظ قَرْنَ استعمال ہوا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے اس کو "قَرار" سے ماخوذ بتایا ہے اور بعض نے "وَقَار" سے۔ اگر اس کو قرار سے لیا جائے تو معنیٰ ہوں گے "قرار پکڑو"، "ٹِک رہو"۔ اور اگر وقار سے لیا جائے تو مطلب ہو گا "سکون سے رہو"، "چین سے بیٹھو"۔ دونوں صورتوں میں آیت کا منشا یہ ہے کہ عورت کا اصل دائرۂ عمل اس کا گھر ہے، اس کو اسی دائرے میں رہ کر اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہییں، اور گھر سے باہر صرف بضرورت ہی نکلنا چاہیے۔ یہ منشا خود آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ حافظ ابوبکر بزّارؒ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ عورتوں نے حضوؐر سے عرض کیا کہ ساری فضیلت تو مرد لُوٹ لے گئے، وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے؟ جواب میں فرمایا: من قعدت منكن في بيتها فانها تدرك عمل المجاهدين۔ "جو تم میں سے گھر میں بیٹھے گی، وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی۔" مطلب یہ ہے کہ مجاہد دل جمعی کے ساتھ اسی وقت تو خدا کی راہ میں لڑ سکتا ہے جب کہ اسے اپنے گھر کی طرف سے پورا اطمینان ہو، اس کی بیوی اس کے گھر اور بچوں کو سنبھالے بیٹھی ہو، اور اسے کوئی خطرہ اس امر کا نہ ہو کہ پیچھے وہ کوئی گُل کھلا بیٹھے گی۔ یہ اطمینان جو عورت اسے فراہم کرے گی وہ گھر بیٹھے اس کے جہاد میں برابر کی حصّہ دار ہو گی۔ ایک اور روایت جو بزّار اور ترمذی نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے نقل کی ہے اس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ: انّ المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان واقرب ما تكون بروحة ربها وهي في قعر بيتها "عورت مستور رہنے کے قابل چیز ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت سے قریب تر وہ اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے گھر میں ہو۔" (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ ۴۹)

قرآنِ مجید کے اس صاف اور صریح حکم کی موجودگی میں اس بات کی آخر کیا گنجایش ہے کہ مسلمان عورتیں کونسلوں اور پارلیمنٹوں کی ممبر بنیں، بیرونِ خانہ کی سوشل سرگرمیوں میں دَوڑتی پھریں، سرکاری دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کریں، کالجوں میں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں، مردانہ ہسپتالوں میں نرسنگ کی خدمت انجام دیں، ہوائی جہازوں اور ریل کاروں میں "مسافرنوازی" کے لیے استعمال کی جائیں، اور تعلیم و تربیت کے لیے امریکا و انگلستان بھیجی جائیں؟ عورت کے بیرونِ خانہ سرگرمیوں کے جواز میں بڑی سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جنگِ جَمل میں حصّہ لیا تھا۔ لیکن یہ اِستدلال جو لوگ پیش کرتے ہیں انھیں شاید معلوم نہیں ہے کہ خود حضرت عائشہؓ کا اپنا خیال اس باب میں کیا تھا۔ عبداللہ بن احمد بن حَنبل نے زوائد الزہد میں، اور ابنِ المُنذِرؒ، ابنِ ابی شَیبہ اور ابنِ سعد

QuranUrdu.com

نے اپنی کتابوں میں مَسْرُوقؒ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ جب تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے اِس آیت (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ) پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹّا بھیگ جاتا تھا، کیونکہ اس پر انھیں اپنی وہ غلطی یاد آ جاتی تھی جو اُن سے جنگِ جَمَل میں ہوئی تھی۔

۴۹- اس آیت میں دو اہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کا سمجھنا آیت کے منشا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ایک تَبَرُّج، دوسرے جاہلیّتِ اُولیٰ۔

تَبَرُّج کے معنیٰ عَرَبی زبان میں نمایاں ہونے، ابھرنے اور کُھل کر سامنے آنے کے ہیں۔ ہر ظاہر اور مُرتَفَع چیز کے لیے عرب لفظ ''بَرَج'' استعمال کرتے ہیں۔ ''بُرج'' کو بُرج اس کے ظہور و اِرتفاع کی بنا پر ہی کہا جاتا ہے۔ بادبانی کشتی کے لیے ''بارِجہ'' کا لفظ اسی لیے بولا جاتا ہے کہ اس کے بادبان دُور سے نمایاں ہوتے ہیں۔ عورت کے لیے جب لفظ تَبَرُّج استعمال کیا جائے تو اس کے تین مطلب ہوں گے: ایک یہ کہ وہ اپنے چہرے اور جسم کا حُسن لوگوں کو دکھائے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس اور زیور کی شان دوسروں کے سامنے نمایاں کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنی چال ڈھال اور چٹک مٹک سے اپنے آپ کو نمایاں کرے۔ یہی تشریح اس لفظ کی اکابرِ اہلِ لُغت اور اکابرِ مفسرین نے کی ہے۔ مجاہدؒ، قَتادَہؒ اور ابنِ ابی نَجِیحؒ کہتے ہیں: التبرّج المشي بتبختُر وتكسر وتغنج ''تَبَرُّج کے معنیٰ ہیں ناز و ادا کے ساتھ لچکے کھاتے اور اِٹھلاتے ہوئے چلنا۔'' مُقاتِلؒ کہتے ہیں: ابداء قلائدها وقرطها وعنقها ''عورت کا اپنے ہار اور اپنے بُندے اور اپنا گلا نمایاں کرنا۔'' اَلْمُبَرَّدؒ کا قول ہے: ان تبدی من محاسنها ما یجب علیها سترهٗ ''یہ کہ عورت اپنے وہ محاسن ظاہر کر دے جن کو اسے چھپانا چاہیے۔'' ابوعُبَیدہ کی تفسیر ہے: ان تُخرج من محاسنها تستدعی به شهوة الرِّجال ''یہ کہ عورت اپنے جسم و لباس کے حسن کو نمایاں کرے جس سے مردوں کو اس کی طرف رغبت ہو۔''

جاہلیّت کا لفظ قرآنِ مجید میں اس مقام کے علاوہ تین جگہ اور استعمال ہوا ہے۔ایک، آلِ عمران کی آیت ۱۵۴ میں، جہاں اللہ کی راہ میں لڑنے سے جی چُرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ ''اللہ کے بارے میں حق کے خلاف جاہلیّت کے سے گمان رکھتے ہیں۔'' دوسرے، سورۂ مائدہ، آیت ۵۰ میں، جہاں خدا کے قانون کے بجائے کسی اور قانون کے مطابق اپنے مقدّمات کا فیصلہ کرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا: ''کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟'' تیسرے، سورۂ فتح، آیت ۲۶ میں، جہاں کفارِ مکہ کے اس فعل کو ''حَمِیّتِ جاہلیہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ انھوں نے محض تعصُّب کی بنا پر مسلمانوں کو عُمرہ نہ کرنے دیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوالدّرداؓ نے کسی شخص سے جھگڑا کرتے ہوئے اس کو ماں کی گالی دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: ''تم میں ابھی تک جاہلیّت موجود ہے۔'' ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''تین کام جاہلیت کے ہیں: دوسروں کے نسب پر طعن کرنا، ستاروں کی گردش سے فال لینا، اور مُردوں پر نوحہ کرنا۔'' ان تمام استعمالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جاہلیت سے مراد اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرزِ عمل ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی اخلاق و آداب اور اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو۔ اور جاہلیّتِ اُولیٰ کا مطلب وہ برائیاں ہیں جن میں اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اور دنیا بھر کے دوسرے لوگ مبتلا تھے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل سے عورتوں کو روکنا چاہتا ہے وہ ان کا اپنے حُسن کی نمائش کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلنا ہے۔ وہ ان کو ہدایت فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو کیونکہ تمھارا اصل کام گھر میں ہے نہ کہ

الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۚ﴿۳۳﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ

زکوٰۃ دو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبیؐ سے گندگی کو دُور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کردے۔[۵۰] یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی اُن باتوں کو جو تمھارے گھروں میں

اس سے باہر۔ لیکن اگر باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس شان کے ساتھ نہ نکلو جس کے ساتھ سابق دَورِ جاہلیّت میں عورتیں نکلا کرتی تھیں۔ بَن ٹھن کر نکلنا، چہرے اور جسم کے حُسن کو زیب و زینت اور چُست لباسوں یا عُریاں لباسوں سے نمایاں کرنا، اور ناز و ادا سے چلنا ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیّت کے طور طریقے ہیں جو اسلام میں نہیں چل سکتے۔ اب یہ بات ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو ثقافت ہمارے ہاں رائج کی جارہی ہے وہ قرآن کی رُو سے اسلام کی ثقافت ہے یا جاہلیت کی ثقافت۔ البتہ اگر کوئی اور قرآن ہمارے کار فرماؤں کے پاس آگیا ہے جس سے اسلام کی یہ نئی روح نکال کر مسلمانوں میں پھیلائی جارہی ہے تو بات دوسری ہے۔

۵۰ – جس سِیاق و سَباق میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں اَهْلَ الْبَيْتِ سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں۔ کیونکہ خطاب کا آغاز ہی يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ کے الفاظ سے کیا گیا ہے اور ماقبل وما بعد کی پوری تقریر میں وہی مخاطَب ہیں۔ علاوہ بریں ''اہل البیت'' کا لفظ عَرَبی زبان میں ٹھیک انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم ''گھر والوں'' کا لفظ بولتے ہیں، اور اس کے مفہوم میں آدمی کی بیوی اور اس کے بچے، دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بیوی کو مستثنیٰ کرکے ''اہلِ خانہ'' کا لفظ کوئی نہیں بولتا۔ خود قرآنِ مجید میں بھی اس مقام کے سوا دو مزید مقامات پر یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ اس کے مفہوم میں بیوی شامل، بلکہ مقدّم ہے۔ سورۂ ہود میں جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی پیدائش کی بشارت دیتے ہیں تو ان کی اہلیہ اسے سُن کر تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں: اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ''کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟ اِس گھر کے لوگو! تم پر تو اللہ کی رحمت ہے اور اس کی برکتیں ہیں۔'' سورۂ قصص میں جب حضرت موسیٰؑ ایک شیر خوار بچے کی حیثیت سے فرعون کے گھر میں پہنچتے ہیں اور فرعون کی بیوی کو کسی ایسی اَنّا کی تلاش ہوتی ہے جس کا دودھ بچہ پی لے تو حضرت موسیٰؑ کی بہن جا کر کہتی ہیں: هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ ''کیا میں تمھیں ایسے گھر والوں کا پتا دوں جو تمھارے لیے اس بچے کی پرورش کا ذمّہ لیں؟'' پس محاورہ، اور قرآن کے استعمالات، اور خود اس آیت کا سیاق و سباق، ہر چیز اس بات پر قطعی دلالت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت میں آپؐ کی ازواجِ مطہرات بھی داخل ہیں اور آپؐ کی اولاد بھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کا اصل خطاب ازواج سے ہے اور اولاد مفہومِ لفظ کے اعتبار سے اس میں شامل قرار پاتی ہے۔ اسی بنا پر ابنِ عباسؓ اور عُروَہؓ بن زبیرؓ اور عِکرِمہؒ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اَهْلَ الْبَيْتِ سے مراد ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

QuranUrdu.com

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ''اَهْلَ الْبَيْتِ'' کا لفظ صرف ازواج کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس میں دوسرا کوئی داخل نہیں ہوسکتا، تو یہ بات بھی غلط ہوگی۔ صرف یہی نہیں کہ ''گھر والوں'' کے لفظ میں آدمی کے سب اہل و عیال شامل ہوتے ہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرمائی ہے کہ وہ بھی شامل ہیں۔ ابنِ ابی حاتم کی رِوایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: تسألنی عن رجل کان من احبّ الناس الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و کانت تحتہ ابنتہ واحبّ الناس الیہ۔ ''تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبُوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضوؐر کی وہ بیٹی تھی جو آپؐ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی۔'' اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا کہ حضوؐر نے حضرت علی اور فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا فرمائی: اللّٰھمّ ھٰؤلاء اھلُ بیتی فَاَذْھِبْ عنھمُ الرِّجس وطھّرھم تطھیرًا ''خدایا! یہ میرے اہلِ بیت ہیں، ان سے گندگی کو دُور کردے اور انھیں پاک کردے۔'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: میں بھی تو آپؐ کے اہلِ بیت میں سے ہوں۔ (یعنی مجھے بھی اس کپڑے میں داخل کر کے میرے حق میں دعا فرمائیے۔) حضوؐر نے فرمایا: ''تم الگ رہو، تم تو خیر ہو ہی۔'' اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث مسلم، ترمذی، احمد، ابنِ جَرِیر، حاکم، بَیہقی وغیرہ محدثین نے ابو سعید خُدریؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت اَنسؓ، حضرت اُمِّ سَلَمہؓ، حضرت واثِلہؓ بن اَسْقَع اور بعض دوسرے صحابہؓ سے نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کے دونوں صاحب زادوں کو اپنا اہل البیت قرار دیا۔ لہٰذا اُن لوگوں کا خیال غلط ہے جو ان حضرات کو اس سے خارج ٹھیراتے ہیں۔

اسی طرح اُن لوگوں کی رائے بھی غلط ہے جو مذکورۂ بالا احادیث کی بنیاد پر ازواجِ مطہراتؓ کو اہل البیت سے خارج ٹھیراتے ہیں۔ اوّل تو جو چیز صراحتاً قرآن سے ثابت ہو اس کو کسی حدیث کے بل پر ردّ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے، خود ان احادیث کا مطلب بھی وہ نہیں ہے جو ان سے نکالا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض رِوایات میں جو یہ بات آئی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس چادر کے نیچے نہیں لیا جس میں حضوؐر نے ان چاروں اصحاب کو لیا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضوؐر نے ان کو اپنے ''گھر والوں'' سے خارج قرار دیا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیویاں تو اہلِ بیت میں شامل تھیں ہی، کیونکہ قرآن نے انھی کو مخاطَب کیا تھا، لیکن حضوؐر کو اندیشہ ہوا کہ ان دوسرے اصحاب کے متعلق ظاہرِ قرآن کے لحاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہوجائے کہ یہ اہلِ بیت سے خارج ہیں، اس لیے آپؐ نے تصریح کی ضرورت ان کے حق میں محسوس فرمائی نہ کہ ازواجِ مطہراتؓ کے حق میں۔

ایک گروہ نے اس آیت کی تفسیر میں صرف اتنا ہی ستم نہیں کیا ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ کو ''اہل البیت'' سے خارج کر کے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے لیے اس لفظ کو خاص کردیا، بلکہ اس پر مزید ستم یہ بھی کیا ہے کہ اس کے الفاظ ''اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کردے'' سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد انبیاؑ کی طرح معصوم ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ''گندگی'' سے مراد خطا اور گناہ ہے اور ارشادِ الٰہی کی رو سے یہ اہل البیت اس سے پاک کردیے گئے ہیں۔ حالانکہ آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ تم سے گندگی دُور کردی گئی اور تم بالکل پاک کردیے گئے۔ بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تم سے گندگی کو دُور کرنا اور تمھیں پاک کردینا چاہتا ہے۔ سیاق و سباق بھی یہ نہیں بتاتا کہ یہاں مناقبِ اہلِ بیت بیان کرنے مقصود ہیں، بلکہ یہاں تو اہلِ بیت کو نصیحت کی گئی ہے کہ تم فلاں کام کرو اور فُلاں کام نہ کرو، اس لیے کہ اللہ تمھیں پاک کرنا چاہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر

QuranUrdu.com

إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ﴿٣٤﴾ إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ

سُنائی جاتی ہیں[51]۔ بے شک اللہ لطیف[52] اور باخبر ہے۔ ؏

بالیقین[53] جو مرد اور جو عورتیں مُسلم ہیں[54]، مومن ہیں[55]، مُطیع فرمان ہیں[56]، راست باز ہیں[57]،

مطلب یہ ہے کہ تم فُلاں رَوِیّہ اختیار کرو گے تو پاکیزگی کی نعمت تمھیں نصیب ہوگی ورنہ نہیں۔ تاہم اگر يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ اللہ نے ان کو معصوم کر دیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وضو اور غسل اور تیمّم کرنے والے سب مسلمانوں کو معصوم نہ مان لیا جائے کیونکہ ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ "مگر اللہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے۔" (المائدہ، آیت ۶)

۵۱ — اصل میں لفظ وَاذْكُرْنَ استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنیٰ ہیں: "یاد رکھو" اور "بیان کرو"۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ کی بیویو! تم کبھی اس بات کو فراموش نہ کرنا کہ تمھارا گھر وہ ہے جہاں سے دنیا بھر کو آیاتِ الٰہی اور حکمت و دانائی کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لیے تمھاری ذمہ داری بڑی سخت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی گھر میں لوگ جاہلیت کے نمونے دیکھنے لگیں۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ نبی کی بیویو! جو کچھ تم سنو اور دیکھو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتی رہو، کیونکہ رسولؐ کے ساتھ ہر وقت کی معاشرت سے بہت سی ہدایات تمھارے علم میں ایسی آئیں گی جو تمھارے سوا کسی اور ذریعے سے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکیں گی۔

اِس آیت میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے: ایک، آیات اللہ۔ دوسرے حکمت۔ آیات اللہ سے مراد تو کتاب اللہ کی آیات ہی ہیں۔ مگر حکمت کا لفظ وسیع ہے جس میں وہ تمام دانائی کی باتیں آ جاتی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اس لفظ کا اِطلاق کتاب اللہ کی تعلیمات پر بھی ہو سکتا ہے، مگر صرف انھی کے ساتھ اس کو خاص کر دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کی آیات سنانے کے علاوہ جس حکمت کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سیرتِ پاک سے اور اپنے ارشادات سے دیتے تھے وہ بھی لامحالہ اس میں شامل ہے۔ بعض لوگ محض اس بنیاد پر کہ آیت میں مَا يُتْلَىٰ (جو تلاوت کی جاتی ہیں) کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آیات اللہ اور حکمت سے مراد صرف قرآن ہے، کیونکہ "تلاوت" کا لفظ اصطلاحاً قرآن کی تلاوت کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن یہ اِستدلال بالکل غلط ہے۔ تلاوت کے لفظ کو اصطلاح کے طور پر قرآن یا کتاب اللہ کی تلاوت کے لیے مخصوص کر دینا بعد کے لوگوں کا فعل ہے۔ قرآن میں اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۲ میں یہی لفظ جادو کے ان منتروں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے۔ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ "انھوں نے پیروی کی اُس چیز کی جس کی تلاوت کرتے تھے (یعنی جسے سناتے تھے) شیاطین سلیمان کی بادشاہی کی طرف منسوب کر کے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اس لفظ کو اس کے لغوی معنیٰ میں استعمال کرتا ہے، کتاب اللہ کی آیات سنانے کے لیے اصطلاحاً مخصوص نہیں کرتا۔

۵۲ — اللہ لطیف ہے، یعنی مخفی سے مخفی باتوں تک اس کا علم پہنچ جاتا ہے۔ اس سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی۔

QuranUrdu.com

وَ الصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِیْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِیْنَ
وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآىٕمِیْنَ وَ الصّٰٓىٕمٰتِ وَ الْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ

صابر ہیں[۵۸]، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں[۵۹]، صدقہ دینے والے ہیں[۶۰]، روزہ رکھنے والے ہیں[۶۱]، اپنی شرمگاہوں کی

۵۳ – پچھلے پیراگراف کے بعد مُتَّصلاً یہ مضمون ارشاد فرما کر ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف کر دیا گیا ہے کہ اُوپر ازواجِ مطہرات کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اُن کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ مسلم معاشرے کو بالعُموم اپنے کردار کی اصلاح انھی ہدایات کے مطابق کرنی چاہیے۔

۵۴ – یعنی جنھوں نے اسلام کو اپنے لیے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ اب وہ اسی کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں، جن کے اندر اسلام کے دیے ہوئے طریقِ فکر اور طرزِ زندگی کے خلاف کسی قسم کی مُزاحمَت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اس کی اطاعت اور اتباع کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔

۵۵ – یعنی جن کی یہ اطاعت محض ظاہری نہیں ہے، بادِلِ ناخواستہ نہیں ہے، بلکہ دل سے وہ اسلام ہی کی رہنمائی کو حق مانتے ہیں۔ ان کا ایمان یہی ہے کہ فکر و عمل کا جو راستہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے، وہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے اور اسی کی پیروی میں ہماری فلاح ہے۔ جس چیز کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے غلط کہہ دیا ہے ان کی اپنی رائے بھی یہی ہے کہ وہ یقیناً غلط ہے، اور جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حق کہہ دیا ہے ان کا اپنا دل و دماغ بھی اسے برحق ہی یقین کرتا ہے۔ ان کے نفس اور ذہن کی حالت یہ نہیں ہے کہ قرآن اور سنّت سے جو حکم ثابت ہو اسے وہ نامناسب سمجھتے ہوں اور اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں کہ کسی طرح اسے بدل کر اپنی رائے کے مطابق، یا دنیا کے چلتے ہوئے طریقوں کے مطابق ڈھال بھی دیا جائے اور یہ الزام بھی اپنے سر نہ لیا جائے کہ ہم نے حکمِ خدا اور رسولؐ میں ترمیم کر ڈالی ہے۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی صحیح کیفیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ذاق طعم الایمان من رضی باللّٰہ ربًّا وبالاسلام دینا وبِمُحمّدٍ رسُولا۔ (مسلم)

ایمان کا لذت شناس ہو گیا وہ شخص جو راضی ہوا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو، اور اسلام ہی اس کا دین ہو، اور محمدؐ ہی اس کے رسول ہوں۔

اور ایک دوسری حدیث میں آپؐ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعًا لما جئتُ بِہٖ ۔ (شرحُ السُّنّۃ)

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اُس چیز کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لایا ہوں۔

۵۶ – یعنی وہ محض مان کر رہ جانے والے بھی نہیں ہیں بلکہ عملاً اطاعت کرنے والے ہیں۔ ان کی یہ حالت نہیں ہے کہ ایمان داری کے ساتھ حق تو اُسی چیز کو مانیں جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے مگر عملاً اس کی خلاف ورزی کریں، اور اپنی مخلصانہ رائے میں تو ان سب کاموں کو بُرا ہی سمجھتے رہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے مگر اپنی عملی زندگی میں ارتکاب انھی کا کرتے چلے جائیں۔

QuranUrdu.com

وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً

حفاظت کرنے والے ہیں[۶۲]، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں[۶۳]، اللہ نے ان کے لیے مغفرت

۵۷ – یعنی اپنی گفتار میں بھی سچّے ہیں اور اپنے معاملات میں بھی کھرے ہیں۔ جھوٹ، فریب، بدنیتی، دغا بازی اور چھَل بَٹّے ان کی زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ ان کی زبان وہی بولتی ہے جسے اُن کا ضمیر صحیح جانتا ہے۔ وہ کام وہی کرتے ہیں جو ایمان داری کے ساتھ ان کے نزدیک راستی و صداقت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور جس سے بھی وہ کوئی معاملہ کرتے ہیں دیانت کے ساتھ کرتے ہیں۔

۵۸ – یعنی خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے اور خدا کے دین کو قائم کرنے میں جو مشکلات بھی پیش آئیں، جو خطرات بھی درپیش ہوں، جو تکلیفیں بھی اُٹھانی پڑیں اور جن نقصانات سے بھی دوچار ہونا پڑے، ان کا پوری ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ کوئی خوف، کوئی لالچ اور خواہشاتِ نفس کا کوئی تقاضا ان کو سیدھی راہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

۵۹ – یعنی وہ تکبّر اور اِستِکبار اور غُرورِ نفس سے خالی ہیں۔ وہ اِس حقیقت کا پورا شعور و احساس رکھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور بندگی سے بالاتر ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے ان کے دل اور جسم دونوں ہی اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ ان پر خدا کا خوف غالب رہتا ہے۔ ان سے کبھی وہ رَوِیّہ ظاہر نہیں ہوتا جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا اور خدا سے بے خوف لوگوں سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ ترتیبِ کلام کو ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اِس عام خدا ترسانہ رَوِیّے کے ساتھ خاص طور پر ''خُشوع'' سے مراد نماز ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی صدقے اور روزے کا ذکر کیا گیا ہے۔

۶۰ – اس سے مراد صرف فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ عام خیرات بھی اس میں شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کھلے دل سے اپنے مال صَرف کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی مدد کرنے میں اپنی حدِ استطاعت تک وہ کوئی دریغ نہیں کرتے۔ کوئی یتیم، کوئی بیمار، کوئی مصیبت زدہ، کوئی ضعیف و معذور، کوئی غریب و محتاج آدمی اُن کی بستیوں میں دستگیری سے محروم نہیں رہتا۔ اور اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے ضرورت پیش آجائے تو اس پر اپنے مال لُٹا دینے میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔

۶۱ – اس میں فرض اور نفل دونوں قسم کے روزے شامل ہیں۔

۶۲ – اس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زنا سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بَرہنگی و عُریانی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ بَرہنگی و عریانی صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی لباس کے بغیر بالکل ننگا ہو جائے۔ بلکہ ایسا لباس پہننا بھی برہنگی ہی ہے جو اتنا رقیق ہو کہ جسم اس میں سے جھلکتا ہو، یا اتنا چُست ہو کہ جسم کی ساخت اور اس کے نشیب و فراز سب اُس میں سے نمایاں نظر آتے ہوں۔

۶۳ – اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اُس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شُعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اُتر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا اس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔ کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا۔ فارغ ہو گا تو الحمد للہ کہے گا۔ سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور

QuranUrdu.com

وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۳۵﴾ وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَ

اور بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔[64]

کسی مومن[65] مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسولؐ کسی

اٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے۔ بات چیت میں بار بار اس کی زبان سے بسم اللہ، الحمدُلِلّٰہ، اِن شاء اللہ، ماشاء اللہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ ہر نعمت ملنے پر اس کا شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طلب گار ہوگا۔ ہر مشکل میں اس سے رُجوع کرے گا۔ ہر بُرائی کا موقع سامنے آنے پر اس سے ڈرے گا۔ ہر قصور سرزد ہو جانے پر اس سے معافی چاہے گا۔ ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دعا مانگے گا۔ غرض اُٹھتے بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کاج کرتے ہوئے اس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہوگا۔ یہ چیز درحقیقت اسلامی زندگی کی جان ہے۔ دوسری جتنی بھی عبادات ہیں ان کے لیے بہرحال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں اور انھیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت جاری رہتی ہے اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض اِن خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اس کی زبان دائماً اس کے ذکر سے تر رہے۔ یہ حالت انسان کی ہو تو اس کی زندگی میں عبادات اور دینی کام ٹھیک اُسی طرح پروان چڑھتے اور نشو ونما پاتے ہیں جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے مزاج کے مطابق آب و ہوا میں لگا ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو زندگی اس دائمی ذکرِ خدا سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اُس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب و ہوا میں لگایا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبرگیری کی وجہ سے پَل رہا ہو۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں یوں واضح فرماتے ہیں:

عن معاذ بن انس الجهني عن رسول الله صلى الله عليه و سلم ان رجلاً سأله اى المجاهدين اعظمُ اجرًا يا رسُول الله؟ قال اكثرهم لِلّٰهِ تعالٰى ذكرًا- قال اىُّ الصائمين اكثر اجرا؟ قال اكثرهم لِلّٰهِ عزّوجل ذكرًا- ثم ذكر الصلٰوة والزكٰوة والحجّ والصَّدَقَةَ كل ذٰلك يقول رسول الله صلى الله عليه وسلم اكثرهم لِلّٰهِ ذكرًا - (مُسندِ احمد)

مُعاذؓ بن اَنَس جُہنِی رِوایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: جو اُن میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا: روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ فرمایا: جو ان میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ "جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو۔"

۶۴ — اس آیت میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل قدر و قیمت کن اوصاف کی ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی قدریں (basic values) ہیں جنھیں ایک فقرے کے اندر سمیٹ دیا گیا ہے۔ اِن قدروں کے لحاظ سے مرد اور عورت کے درمیان

QuranUrdu.com

رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ
يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ ۝۳۶

معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اُس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔[۶۶]

کوئی فرق نہیں ہے۔ عمل کے لحاظ سے تو بلا شبہ دونوں صِنفوں کا دائرۂ کار الگ ہے۔ مردوں کو زندگی کے کچھ شعبوں میں کام کرنا ہے اور عورتوں کو کچھ اور شعبوں میں۔ لیکن اگر یہ اوصاف دونوں میں یکساں موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں دونوں کا مرتبہ یکساں اور دونوں کا اجر برابر ہوگا۔ اس لحاظ سے ان کے مرتبے اور اجر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ ایک نے چُولھا چکّی سنبھالا اور دوسرے نے خلافت کی مَسنَد پر بیٹھ کر احکامِ شریعت جاری کیے ایک نے گھر میں بچے پالے اور دوسرے نے میدانِ جنگ میں جا کر اللہ اور اس کے دین کے لیے جان لڑائی۔

۶۵ – یہاں سے وہ آیات شروع ہوتی ہیں جو حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے سلسلے میں نازل ہوئی تھیں۔

۶۶ – ابنِ عباسؓ، مُجاہدؒ، قَتادہ، عِکرِمہؒ اور مُقاتِلؒ بن حَیّان کہتے ہیں کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا تھا اور حضرت زینبؓ اور ان کے رشتہ داروں نے اسے نامنظور کر دیا تھا۔ ابنِ عباسؓ کی رِوایت ہے کہ جب حضورؐ نے یہ پیغام دیا تو حضرت زینبؓ نے کہا: انا خیر منہ نسبًا، ''میں اُس سے نسب میں بہتر ہوں۔'' ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ انھوں نے جواب میں یہ بھی کہا تھا کہ: لا ارضاہ لنفسی وانا ایم قریش۔ ''میں اُسے اپنے لیے پسند نہیں کرتی، میں قریش کی شریف زادی ہوں۔'' اسی طرح کا اظہارِ ناراضامندی اُن کے بھائی عبداللہ بن جَحْش رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا۔ اس لیے کہ حضرت زیدؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی (اُمَیمہ بنتِ عبدالمُطّلِب) کی صاحب زادی تھیں۔ ان لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ اتنے اُونچے گھرانے کی لڑکی، اور وہ بھی کوئی غیر نہیں بلکہ حضورؐ کی اپنی پھوپھی زاد بہن ہے، اور اس کا پیغام آپؐ اپنے آزاد کردہ غلام کے لیے دے رہے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اسے سنتے ہی حضرت زینبؓ اور ان کے سب خاندان والوں نے بلا تأمّل سرِ اطاعت خم کر دیا۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح پڑھایا، خود حضرت زیدؓ کی طرف سے دس دینار اور ۶۰ دِرہم مَہر ادا کیا، چڑھاوے کے کپڑے دیے، اور کچھ سامانِ خوراک گھر کے خرچ کے لیے بھجوا دیا۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع پر نازل ہوئی ہے، مگر جو حکم اس میں بیان کیا گیا ہے وہ اسلامی آئین کا اصل الاصول ہے، اور اس کا اطلاق پورے اسلامی نظامِ زندگی پر ہوتا ہے۔ اس کی رو سے کسی مسلمان فرد، یا قوم، یا ادارے، یا عدالت، یا پارلیمنٹ، یا ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو اس میں وہ خود اپنی آزادیِ رائے استعمال کرے۔ مسلمان ہونے کے معنیٰ ہی خدا اور رسولؐ کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دستبردار ہو جانے کے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کا

QuranUrdu.com

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ

اے نبیؐ[۶۷]! یاد کرو وہ موقع جب تم اُس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا[۶۸] کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر[۶۹]۔" اُس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ تعالیٰ کھولنا چاہتا تھا،

مسلمان بھی ہونا اور اپنے لیے اس اختیار کو محفوظ بھی رکھنا، دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ کوئی ذی عقل انسان ان دونوں رَویّوں کو جمع کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ جسے مسلمان رہنا ہو اس کو لازماً حکمِ خدا و رسولؐ کے آگے جھک جانا ہو گا۔ اور جسے نہ جھکنا ہو اس کو سیدھی طرح ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ نہ مانے گا تو چاہے اپنے مسلمان ہونے کا وہ کتنا ہی ڈھول پیٹے، خدا اور خَلق دونوں کی نگاہ میں وہ منافق ہی قرار پائے گا۔

۶۷ – یہاں سے آیت ۴۸ تک کا مضمون اُس وقت نازل ہوا جب حضرت زینبؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کر چکے تھے اور اس پر منافقین، یہود اور مشرکین نے آپؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفانِ عظیم برپا کر رکھا تھا۔ ان آیات کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات اُن دشمنوں کی تفہیم کے لیے نہیں تھے جو قصداً حضورؐ کو بدنام کرنے اور اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے جھوٹ اور بہتان اور طعن و تشنیع کی مہم چلا رہے تھے، بلکہ اصل مقصود مسلمانوں کو اُن کی اِس مہم کے اثرات سے بچانا اور ان کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات سے محفوظ کرنا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا کلام منکرین کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے اگر اطمینان نصیب ہو سکتا تھا تو انھی لوگوں کو جو جانتے اور مانتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اِن بندگانِ حق کے متعلق اس وقت یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دشمنوں کے اعتراضات کہیں ان کے دلوں میں بھی شک اور ان کے دماغوں میں بھی اُلجھن نہ پیدا کر دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تمام امکانی شبہات کا ازالہ فرمایا، اور دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ بتایا کہ ان حالات میں ان کا رَویّہ کیا ہونا چاہیے۔

۶۸ – مراد ہیں حضرت زیدؓ، جیسا کہ آگے بصراحت بیان فرما دیا گیا ہے۔ اُن پر اللہ تعالیٰ کا احسان کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان کیا؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً یہاں اُن کا قصّہ بیان کر دیا جائے۔ یہ دراصل قبیلۂ کَلْب کے ایک شخص حارِثہ بن شَراحِیل کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سُعدیٰ بنت ثَعْلَبَہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی مَعْن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچّے تھے اس وقت ان کی ماں انھیں اپنے میکے لے کر گئیں۔ وہاں بنی قَیْن بن جَسْر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لُوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے گئے اُن میں حضرت زیدؓ بھی تھے۔ پھر انھوں نے طائف کے قریب عُکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خَدیجہؓ کے بھتیجے حَکِیم بن حِزَام تھے۔ انھوں نے مکہ لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں نذر کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت خَدِیجہؓ کا جب نکاح ہوا تو حضورؐ نے ان کے ہاں زیدؓ کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپؐ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپؐ نے انھیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اُس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا

QuranUrdu.com

وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ

تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زیدؓ اُس سے اپنی

تھا۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتا چلا کہ ہمارا بچہ مکے میں ہے۔ وہ انھیں تلاش کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپؐ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپؐ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمھارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمھارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ انھوں نے کہا: یہ تو آپ نے انصاف سے بھی بڑھ کر دُرست بات فرمائی ہے۔ آپ بچے کو بُلا کر پوچھ لیجیے۔ حضورؐ نے زیدؓ کو بلایا اور ان سے کہا: اِن دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمھیں پوری آزادی ہے کہ چاہو اِن کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو میرے ساتھ رہو۔ انھوں نے جواب دیا: میں آپؐ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ ان کے باپ اور چچا نے کہا: زید! کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے، اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اِس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں اُن کا تجربہ کر لینے کے بعد میں اب دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ زیدؓ کا یہ جواب سن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضورؐ نے اسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمعِ عام میں اعلان فرمایا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنھوں نے ایک لمحہ شک و تردُّد کے بغیر آپؐ سے نبوت کا دعویٰ سنتے ہی اسے تسلیم کر لیا۔ ایک حضرت خدیجہؓ، دوسرے حضرت زیدؓ، تیسرے حضرت علیؓ اور چوتھے حضرت ابوبکرؓ۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۳۰ سال تھی اور ان کو حضورؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ سال گزر چکے تھے۔ ہجرت کے بعد ۴ ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح کر دیا، اپنی طرف سے اُن کا مہر ادا کیا، اور گھر بسانے کے لیے ان کو ضروری سامان عنایت فرمایا۔

یہی حالات ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ اِن الفاظ میں اشارہ فرما رہا ہے کہ "جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا۔"

۶۹۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے، اور انھوں نے بار بار شکایات پیش کرنے کے بعد آخر کار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم مان کر ان کے نکاح میں جانا قبول کر لیا تھا، لیکن وہ اپنے دل سے اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام ہیں، اُن کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں، اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کم تر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے اِزدواجی زندگی میں انھوں نے کبھی حضرت زیدؓ کو اپنے برابر کا نہ سمجھا اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدّت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔

QuranUrdu.com

مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰكَهَا لِكَيۡ لَا يَكُوۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ حَرَجٌ فِيۡۤ

حاجت پوری کرچکا^{۷۱} تو ہم نے اس (مُطلّقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا^{۷۲} تاکہ مومنوں پر اپنے بولے بیٹوں کی

۷۰- بعض لوگوں نے اس فقرے کا الٹا مطلب یہ نکال لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت زینبؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے، اور آپؐ کا جی چاہتا تھا کہ حضرت زیدؓ ان کو طلاق دے دیں، مگر جب انھوں نے آکر عرض کیا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپؐ نے، معاذ اللہ! اوپری دل سے ان کو منع کیا، اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ "تم دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا" حالاں کہ اصل بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر اس سورہ کی آیات نمبر ۱، ۲، ۳ اور ۷ کے ساتھ ملا کر یہ فقرہ پڑھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت زیدؓ اور ان کی اہلیہ کے درمیان تلخی بڑھتی چلی جارہی تھی اُسی زمانے میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اشارہ کر چکا تھا کہ زیدؓ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو ان کی مُطلَّقہ خاتون سے آپؐ کو نکاح کرنا ہوگا لیکن چونکہ حضورؐ جانتے تھے کہ عرب کی اس سوسائٹی میں منہ بولے بیٹے کی مُطلَّقہ سے نکاح کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے — اور وہ بھی عین اس حالت میں جب کہ مٹھی بھر مسلمانوں کے سوا باقی سارا عرب آپؐ کے خلاف پہلے ہی خار کھائے بیٹھا تھا — اس لیے آپؐ اس شدید آزمایش میں پڑنے سے ہچکچا رہے تھے۔ اسی بنا پر جب حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ آپؐ کا منشا یہ تھا کہ یہ شخص طلاق نہ دے تو میں اِس بلا میں پڑنے سے بچ جاؤں، ورنہ اس کے طلاق دے دینے کی صورت میں مجھے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی اور پھر مجھ پر وہ کیچڑ اُچھالی جائے گی کہ پناہ بخدا۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو اُولوا العزمی اور رضا بقضا کے جس بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتا تھا اُس کے لحاظ سے حضورؐ کی یہ بات اُس کو فروتر نظر آئی کہ آپؐ نے قصداً زیدؓ کو طلاق سے روکا تاکہ آپؐ اس کام سے بچ جائیں جس میں آپؐ کو بدنامی کا اندیشہ تھا، حالانکہ اللہ ایک بڑی مصلحت کی خاطر وہ کام آپؐ سے لینا چاہتا تھا۔ "تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو" کے الفاظ صاف صاف اسی مضمون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

یہی بات اس آیت کی تشریح میں امام زین العابدین حضرت علیؓ بن حسینؓ نے فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دے چکا تھا کہ زینبؓ آپ کی بیویوں میں شامل ہونے والی ہیں، مگر جب زیدؓ نے آکر ان کی شکایت آپؐ سے کی تو آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو نہ چھوڑو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمھیں پہلے خبر دے چکا تھا کہ میں تمھارا نکاح زینبؓ سے کرنے والا ہوں۔ تم زیدؓ سے یہ بات کہتے وقت اُس بات کو چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا" (ابنِ جریر، ابنِ کثیر بحوالہ ابنِ ابی حاتم)

علامۂ آلُوسی نے بھی تفسیر رُوح المعانی میں اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ عتاب ہے ترکِ اَولیٰ پر۔ اس حالت میں اَولیٰ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے، یا زیدؓ سے فرما دیتے کہ تم جو کچھ کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ عتاب کا ماحَصَل یہ ہے کہ تم نے زیدؓ سے یہ کیوں کہا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو، حالانکہ میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ زینبؓ تمھاری بیویوں میں شامل ہوں گی۔"

۷۱- یعنی جب زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ان کی عدّت پوری ہوگئی۔ "حاجت پوری کرچکا" کے الفاظ سے

QuranUrdu.com

اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ
مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ
لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا
مَّقْدُوْرَا ﴿۳۸﴾ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ

بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے، جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں[۷۳]۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔ نبیؐ پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو[۷۴]۔ یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاؑ کے معاملے میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں، اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے[۷۵]۔ (یہ اللہ کی سنت ہے اُن لوگوں کے لیے) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں

خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زیدؓ کی اس سے کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ اور یہ صورتِ حال محض طلاق دے دینے سے رونما نہیں ہوتی، کیونکہ عدّت کے دَوران میں شوہر کو اگر کچھ دلچسپی باقی ہو تو وہ رُجوع کر سکتا ہے، اور شوہر کی یہ حاجت بھی مُطلّقہ بیوی سے باقی رہتی ہے کہ اس کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا پتا چل جائے۔ اس لیے مُطلّقہ بیوی کے ساتھ اس کے سابق شوہر کی حاجت صرف اُسی وقت ختم ہوتی ہے جب عدّت گزر جائے۔

۷۲ – یہ الفاظ اس باب میں صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکاح خود اپنی خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر کیا تھا۔

۷۳ – یہ الفاظ اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی ضرورت اور مَصلَحَت کی خاطر کرایا تھا جو اس تدبیر کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ عرب میں منہ بولے رشتوں کے بارے میں جو غلط رُسوم رائج ہو گئی تھیں، ان کے توڑنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اللہ کا رسول خود آگے بڑھ کر ان کو توڑ ڈالے۔ لٰہذا یہ نکاح اللہ تعالیٰ نے محض نبی کے گھر میں ایک بیوی کا اضافہ کرنے کی خاطر نہیں بلکہ ایک اہم ضرورت کی خاطر کروایا۔

۷۴ – ان الفاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے تو اس طرح کا نکاح محض مباح ہے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ایک فرض تھا جو اللہ نے آپؐ پر عائد کیا تھا۔

۷۵ – یعنی انبیاؑ کے لیے ہمیشہ سے یہ ضابطہ مقرر رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم بھی آئے اس پر عمل کرنا ان کے لیے قضائے مُبرَم ہے جس سے کوئی مَفر اُن کے لیے نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر کوئی کام فرض کر دے تو اسے وہ کام کر کے ہی رہنا ہوتا ہے، خواہ ساری دنیا اس کی مخالفت پر تُل گئی ہو۔

QuranUrdu.com

وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ
اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ لا وَّ

ع ۵ ۲

اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور محاسبے کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔^{۷۶}

(لوگو) محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسولؐ اور خاتم النّبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔^{۷۷} ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام

۷۶ – اصل الفاظ ہیں: كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا۔ اس کے دو معنیٰ ہیں: ایک یہ کہ ہر خوف اور خطرے کے مقابلے میں اللہ کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کسی اور کی باز پُرس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۷۷ – اس ایک فقرے میں اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح پر کر رہے تھے۔

اُن کا اوّلین اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے اپنی بہو سے نکاح کیا ہے حالانکہ آپؐ کی اپنی شریعت میں بھی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ "محمدؐ تمھارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں"، یعنی جس شخص کی مطلّقہ سے نکاح کیا گیا ہے وہ بیٹا تھا کب کہ اس کی مُطلّقہ سے نکاح حرام ہوتا؟ تم لوگ تو خود جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سرے سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا، اگر منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے تب بھی اس کی چھوڑی ہوئی عورت سے نکاح کر لینا زیادہ سے زیادہ بس جائز ہی ہو سکتا تھا، آخر اس کا کرنا کیا ضرور تھا۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا: "مگر وہ اللہ کے رسول ہیں"، یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمھاری رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے اس کے بارے میں تمام تعصّبات کا خاتمہ کر دیں اور اس کی حِلّت کے معاملے میں کسی شک و شبہ کی گنجایش باقی نہ رہنے دیں۔

پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا "اور وہ خاتم النّبیین ہیں"، یعنی ان کے بعد کوئی رسول تو درکنار، کوئی نبی تک آنے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح اُن کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کسر پوری کر دے، لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس رسمِ جاہلیّت کا خاتمہ وہ خود ہی کر کے جائیں۔

اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ "اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"، یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس رسمِ جاہلیّت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اب اُس کی طرف سے کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لہٰذا اگر اپنے آخری نبی کے ذریعے سے اُس نے اس رسم کا خاتمہ اب نہ کرایا تو پھر کوئی دوسری ہستی

QuranUrdu.com

سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ
لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾
تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾

اس کی تسبیح کرتے رہو[۷۸]۔ وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمھارے لیے دُعائے رحمت کرتے ہیں، تاکہ وہ تمھیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے، وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے[۷۹]۔ جس روز وہ اس سے ملیں گے اُن کا استقبال سلام سے ہوگا[۸۰] اور ان کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر فراہم کر رکھا ہے۔

دنیا میں ایسی نہ ہوگی جس کے توڑنے سے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔ بعد کے مصلحین اگر اسے توڑیں گے بھی تو ان میں سے کسی کا فعل بھی اپنے پیچھے ایسا دائمی اور عالم گیر اقتدار نہ رکھے گا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں، اور ان میں سے کسی کی شخصیت بھی اپنے اندر اس تقدُّس کی حامل نہ ہوگی کہ کسی فعل کا محض اُس کی سنت ہونا ہی لوگوں کے دلوں سے کراہیّت کے ہر تصور کا قلع قمع کردے۔

افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں ایک گروہ نے اس آیت کی غلط تاویلات کر کے ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس لیے ختمِ نبوت کے مسئلے کی پوری توضیح اور اس گروہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی تردید کے لیے ہم نے اِس سورہ کی تفسیر کے آخر میں ایک مفصل ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔

۷۸ – اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا ہے کہ جب دشمنوں کی طرف سے اللہ کے رسولؐ پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہو اور دینِ حق کو زک پہنچانے کے لیے ذاتِ رسولؐ کو ہدف بنا کر پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا جا رہا ہو، ایسی حالت میں اہلِ ایمان کا کام نہ تو یہ ہے کہ ان بے ہودگیوں کو اطمینان کے ساتھ سنتے رہیں، اور نہ یہ کہ خود بھی دشمنوں کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں، اور نہ یہ کہ جواب میں ان سے گالم گلوچ کرنے لگیں، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ عام دنوں سے بڑھ کر اس زمانے میں خُصوصیّت کے ساتھ اللہ کو اور زیادہ یاد کریں۔ ’’اللہ کو کثرت سے یاد کرنے‘‘ کا مفہوم حاشیہ ۶۳ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ صبح و شام تسبیح کرنے سے مراد دائماً تسبیح کرتے رہنا ہے۔ اور تسبیح کے معنیٰ اللہ کی پاکیزگی بیان کرنے کے ہیں، نہ کہ محض دانوں والی تسبیح پھرانے کے۔

۷۹ – اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ احساس دلانا ہے کہ کفار و منافقین کی ساری جلن اور کُڑھن اس رحمت ہی کی وجہ سے ہے جو اللہ کے اس رسول کی بدولت تمھارے اُوپر ہوئی ہے۔ اُسی کے ذریعے سے ایمان کی دولت تمھیں نصیب ہوئی، کفر و جاہلیّت کی تاریکیوں سے نکل کر تم اسلام کی روشنی میں آئے، اور تمھارے اندر یہ بلند اَخلاقی و اجتماعی اوصاف پیدا ہوئے جن کے باعث تم عَلانیَہ دوسروں سے برتر نظر آتے ہو۔ اسی کا غصہ ہے جو حاسد لوگ اللہ کے رسولؐ پر نکال رہے ہیں۔ اس حالت میں کوئی ایسا رَوِیّہ اختیار نہ کر بیٹھنا جس سے تم

QuranUrdu.com

يَآيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ

اَے نبیؐ[81]! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر[82]، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر[83]، اللہ کی اجازت

خدا کی اس رحمت سے محروم ہو جاؤ۔

صلوٰۃ کا لفظ جب عَلٰی کے صلے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ رحمت، مہربانی اور شفقت کے ہوتے ہیں۔ اور جب ملائکہ کی طرف سے انسانوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ دعائے رحمت کے ہوتے ہیں، یعنی ملائکہ انسانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ تو اِن پر فضل فرما اور اپنی عنایات سے انھیں سرفراز کر۔ ایک مفہوم یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ کا یہ بھی ہے کہ یشیع عنکم الذکر الجمیل فی عباد اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے بندوں کے درمیان ناموری عطا فرماتا ہے اور تمھیں اس درجے کو پہنچا دیتا ہے کہ خلق خدا تمھاری تعریف کرنے لگتی ہے اور ملائکہ تمھاری مدح وثنا کے چرچے کرتے ہیں۔

۸۰ – اصل الفاظ ہیں: تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ۔ "ان کا تحیّہ اس سے ملاقات کے روز سلام ہوگا۔" اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ اللہ تعالیٰ خود السّلام علیکم کے ساتھ ان کا استقبال فرمائے گا، جیسا کہ سورۂ یٰسین میں فرمایا: سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (آیت ۵۸) دوسرے، یہ کہ ملائکہ ان کو سلام کریں گے، جیسے سورۂ نحل میں ارشاد ہوا:

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

"جن لوگوں کی رُوحیں ملائکہ اس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے، اُن سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں اپنے اُن نیک اعمال کی بدولت جو تم دنیا میں کرتے تھے۔" (آیت ۳۲) تیسرے، یہ کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو سلام کریں گے، جیسے سورۂ یونس میں فرمایا: دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ خدایا! پاک ہے تیری ذات، ان کا تحیّہ ہوگا سلام، اور اُن کی تان ٹوٹے گی اس بات پر کہ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔" (آیت ۱۰)

۸۱ – مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو خطاب کر کے چند کلماتِ تسکین ارشاد فرماتا ہے۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ آپ کو ہم نے یہ کچھ مراتب عالیہ بخشے ہیں، آپؐ کی شخصیت اس سے بہت بلند ہے کہ یہ مخالفین اپنے بہتان و افترا کے طوفان اُٹھا کر آپؐ کا کچھ بگاڑ سکیں۔ لہٰذا آپؐ نہ ان کی شرارتوں سے رنجیدہ ہوں اور نہ ان کے پروپیگنڈے کو پرکاہ کے برابر بھی کوئی وقعت دیں۔ اپنے فرائضِ منصبی ادا کیے جائیے اور انھیں جو کچھ ان کا جی چاہے بکنے دیجیے۔ اس کے ساتھ ضمناً تمام خلق کو، جس میں مومن و کافر سب شامل ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا سابقہ کسی معمولی انسان سے نہیں ہے، بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بلند ترین مقام پر سرفراز فرمایا ہے۔

۸۲ – نبیؐ کو "گواہ" بنانے کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے جس میں تین قسم کی شہادتیں شامل ہیں: ایک قولی شہادت، یعنی یہ کہ اللہ کا دین جن حقائق اور اُصولوں پر مبنی ہے، نبیؐ ان کی صداقت کا گواہ بن کر کھڑا ہو اور دنیا سے صاف صاف کہہ دے کہ وہی حق ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے باطل ہے۔ خدا کی ہستی اور اس کی توحید، ملائکہ کا وجود، وحی کا

QuranUrdu.com

نُزول، حیات بعد الموت کا وقوع اور جنت و دوزخ کا ظُہور خواہ دنیا کو کیسا ہی عجیب معلوم ہو اور دنیا ان باتوں کے پیش کرنے والے کا مذاق اڑائے یا اسے دیوانہ کہے، مگر نبی کسی کی پروا کیے بغیر اٹھے اور ہانک پکار کر کہہ دے کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے اور گمراہ ہیں وہ لوگ جو اسے نہیں مانتے۔ اسی طرح اَخلاق اور تہذیب اور تمدُّن کے جو تصورات، اقدار، اُصول اور ضابطے خدا نے اس پر منکشف کیے ہیں، انھیں اگر ساری دنیا غلط کہتی ہو اور ان کے خلاف چل رہی ہو تب بھی نبی کا کام یہ ہے کہ انھی کو علَی الاعلان پیش کرے اور اُن تمام خیالات اور طریقوں کو غلط قرار دے جو ان کے خلاف دنیا میں رائج ہوں۔ اسی طرح جو کچھ خدا کی شریعت میں حلال ہے نبی اس کو حلال ہی کہے خواہ ساری دنیا اسے حرام سمجھتی ہو، اور جو کچھ خدا کی شریعت میں حرام ہے نبی اس کو حرام ہی کہے، خواہ ساری دنیا اسے حلال وطیّب قرار دے رہی ہو۔

دوسرے عملی شہادت، یعنی یہ کہ نبی اپنی پوری زندگی میں اُس مسلک کا عملاً مظاہرہ کرے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ جس چیز کو وہ بُرائی کہتا ہے اُس کے ہر شائبے سے اس کی زندگی پاک ہو۔ جس چیز کو وہ بھلائی کہتا ہے اس کی اپنی سیرت میں وہ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ جس چیز کو وہ فرض کہتا ہے اسے ادا کرنے میں وہ سب سے بڑھ کر ہو۔ جس چیز کو وہ گناہ کہتا ہے اس سے بچنے میں کوئی اس کی برابری نہ کر سکے۔ جس قانونِ حیات کو وہ خدا کا قانون کہتا ہے اسے نافذ کرنے میں وہ کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے۔ اس کا اپنا اخلاق و کردار اس بات پر گواہ ہو کہ وہ اپنی دعوت میں کس قدر سچّا اور کتنا مخلص ہے۔ اور اس کی ذات اس کی تعلیم کا ایسا مجسّم نمونہ ہو جسے دیکھ کر ہر شخص معلوم کر لے کہ جس دین کی طرف وہ دنیا کو بلا رہا ہے وہ کس معیار کا انسان بنانا چاہتا ہے، کیا کردار اُس میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اور کیا نظامِ زندگی اُس سے برپا کرانا چاہتا ہے۔

تیسرے اُخروی شہادت، یعنی آخرت میں جب اللہ کی عدالت قائم ہو اس وقت نبی اس امر کی شہادت دے کہ جو پیغام اس کے سُپرد کیا گیا تھا وہ اس نے بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق واضح کر دینے میں اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اِسی شہادت پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ماننے والے کس جزا کے، اور نہ ماننے والے کس سزا کے مستحق ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت کے مقام پر کھڑا کر کے اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی ذمہ داری آپؐ پر ڈالی تھی اور وہ کیسی عظیم شخصیت ہونی چاہیے جو اس مقامِ بلند پر کھڑی ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دینِ حق کی قولی اور عملی شہادت پیش کرنے میں ذرّہ برابر بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے، تبھی تو آخرت میں آپؐ یہ شہادت دے سکیں گے کہ میں نے لوگوں پر حق پوری طرح واضح کر دیا تھا، اور تبھی اللہ کی حجت لوگوں پر قائم ہو گی۔ ورنہ اگر، معاذ اللہ! آپؐ ہی سے یہاں شہادت ادا کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو نہ آپؐ آخرت میں اُن پر گواہ ہو سکتے ہیں اور نہ منکرینِ حق کے خلاف مقدّمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس شہادت کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں لوگوں کے اعمال پر شہادت دیں گے، اور اس سے وہ یہ اِستدلال کرتے ہیں کہ حضورؐ تمام لوگوں کے اعمال کو دیکھ رہے ہیں، ورنہ بے دیکھے شہادت کیسے دے سکیں گے۔ لیکن قرآنِ مجید کی رُو سے یہ تاویل قطعاً غلط ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ لوگوں کے اعمال پر شہادت قائم کرنے کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا ہی انتظام فرمایا ہے۔ اس غرض کے لیے اُس کے فرشتے ہر شخص کا نامۂ اعمال تیار کر رہے ہیں

QuranUrdu.com

(ملاحظہ ہو: قٓ، آیات ۱۷-۱۸۔ اور الکہف، آیت ۴۹) اور اس کے لیے وہ لوگوں کے اپنے اعضا سے بھی گواہی لے لے گا۔ (یٰسٓ ۶۵۔ حٰمٓ السجدہ ۲۰-۲۱) رہے انبیا علیہم السلام، تو ان کا کام بندوں کے اعمال پر گواہی دینا نہیں بلکہ اس بات پر گواہی دینا ہے کہ بندوں تک حق پہنچا دیا گیا تھا۔ قرآن صاف فرماتا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ (المائدہ:۱۰۹)

جس روز اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا، پھر پوچھے گا کہ تمھاری دعوت کا کیا جواب دیا گیا، تو وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں، تمام غیب کی باتوں کو جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔

اور اسی سلسلے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ جب اُن سے عیسائیوں کی گمراہی کے متعلق سوال ہوگا تو وہ عرض کریں گے:

وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (المائدہ:۱۱۷)

میں جب تک ان کے درمیان تھا، اسی وقت تک اُن پر گواہ تھا۔ جب آپ نے مجھے اُٹھا لیا تو آپ ہی ان پر نگراں تھے۔

یہ آیات اِس باب میں بالکل صریح ہیں کہ انبیا علیہم السلام اعمالِ خَلق کے گواہ نہیں ہوں گے۔ پھر وہ گواہ کس چیز کے ہوں گے؟ اس کا جواب قرآن اتنی ہی صراحت کے ساتھ یہ دیتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرہ، ۱۴۳)

اور اَے مسلمانو! اِسی طرح ہم نے تم کو ایک اُمّتِ وَسط بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النحل، ۸۹)

اور جس روز ہم ہر اُمت میں انھی کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں گے جو اُن پر گواہی دے گا اور (اے محمدؐ!) تمھیں اِن لوگوں پر گواہ کی حیثیت سے لائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اپنی نوعیت میں اُس شہادت سے مختلف نہ ہوگی جسے ادا کرنے کے لیے حضورؐ کی اُمّت کو اور ہر اُمّت پر گواہی دینے والے شہدا کو بلایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ شہادت اعمال کی ہو تو ان سب کا بھی حاضر و ناظر ہونا لازم آتا ہے۔ اور اگر یہ گواہ صرف اس امر کی شہادت دینے کے لیے بلائے جائیں گے کہ خلق تک اس کے خالق کا پیغام پہنچ گیا تھا تو لامحالہ حضورؐ بھی اسی غرض کے لیے پیش ہوں گے۔

اسی مضمون کی تائید وہ احادیث بھی کرتی ہیں جن کو بخاری، مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ اور امام احمد وغیرہم نے عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، ابوالدَّرداؓ، انَسؓ بن مالک اور بہت سے دوسرے صحابہؓ سے نقل کیا ہے، جن کا مشترک مضمون یہ ہے کہ نبیؐ قیامت کے روز اپنے بعض اصحاب کو دیکھیں گے کہ وہ لائے جا رہے ہیں، مگر وہ آپؐ کی طرف آنے کے بجائے دوسرے رُخ پر جا رہے ہوں گے یا دھکیلے جا رہے ہوں گے۔ حضورؐ ان کو دیکھ کر عرض کریں گے کہ خدایا! یہ تو میرے صحابی ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نہیں جانتے کہ تمھارے بعد انھوں نے کیا کرتوت کیے ہیں۔ یہ مضمون اتنے صحابہؓ سے اتنی کثیر سندوں کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ اس کی

دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ
بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ
وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

سے اُس کی طرف دعوت دینے والا[۸۴] بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ اور ہرگز نہ دبو کفّار و منافقین سے، کوئی پروانہ کرو ان کی اذیّت رسانی کی اور بھروسا کر لو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دے۔

صحّت میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں۔ اور اس سے یہ بات صریحاً ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے ایک ایک شخص اور اس کی ایک ایک حرکت کے شاہد قطعاً نہیں ہیں۔ رہی وہ حدیث جس میں یہ ذکر آیا ہے کہ حضورؐ کے سامنے آپؐ کی اُمت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، تو وہ کسی طرح بھی اس مضمون سے متعارض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضورؐ کو اُمت کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس کے یہ معنیٰ کب ہیں کہ حضورؐ ہر شخص کے اعمال کا عینی مشاہدہ فرما رہے ہیں۔

۸۳ – یہاں اس فرق کو ملحوظ رکھیے کہ کسی شخص کا بطورِ خود ایمان و عملِ صالح پر اچھے انجام کی بشارت دینا اور کفر و بدعملی پر بُرے انجام سے ڈرانا اَور بات ہے اور کسی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشر و نذیر بنا کر بھیجا جانا بالکل ہی ایک دوسری بات۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس منصب پر مامور ہو وہ تو اپنی بشارت اور اپنے انذار کے پیچھے لازماً ایک اقتدار رکھتا ہے جس کی بنا پر اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا کسی کام پر بشارت دینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ جس احکم الحاکمین کی طرف سے وہ بھیجا گیا ہے وہ اس کام کے پسندیدہ اور مستحقِ اجر ہونے کا اعلان کر رہا ہے، لہٰذا وہ یقیناً فرض یا واجب یا مستحب ہے اور اس کا کرنے والا ضرور اجر پائے گا۔ اور اُس کا کسی کام کے بُرے انجام کی خبر دینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ قادرِ مُطلق اس کام سے منع کر رہا ہے لہٰذا وہ ضرور گناہ اور حرام ہے اور یقیناً اس کا مرتکب سزا پائے گا۔ یہ حیثیت کسی غیر مامور کی بشارت اور تنبیہ کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۸۴ – یہاں بھی ایک عام مبلّغ کی تبلیغ اور نبی کی تبلیغ کے درمیان وہی فرق ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ دعوت الی اللہ تو ہر مُبلّغ دیتا اور دے سکتا ہے، مگر وہ اللہ کی طرف سے اِس کام پر مامور نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نبی اللہ کے اِذن (sanction) سے دعوت دینے اُٹھتا ہے۔ اس کی دعوت نری تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بھی اس کے بھیجنے والے ربّ العالمین کی فرمانروائی کا زور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے بھیجے ہوئے داعی کی مزاحمت خود اللہ کے خلاف جنگ قرار پاتی ہے، جس طرح دنیوی حکومتوں میں سرکاری کام انجام دینے والے سرکاری ملازم کی مزاحمت خود حکومت کے خلاف جنگ سمجھی جاتی ہے۔

QuranUrdu.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ فَمَا لَكُمۡ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ عِدَّةٍ تَعۡتَدُّوۡنَهَا‌ ۚ فَمَتِّعُوۡهُنَّ وَسَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ﴿۴۹﴾

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو[۸۵] تو تمھاری طرف سے ان پر کوئی عدّت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ لہٰذا انھیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔[۸۶]

۸۵ – یہ عبارت اس باب میں صریح ہے کہ یہاں لفظِ نکاح کا اطلاق صرف عقد پر کیا گیا ہے۔ علمائے لغت میں اس امر پر بہت کچھ اختلاف ہوا ہے کہ عَرَبی زبان میں نکاح کے اصل معنیٰ کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ ان دونوں میں معناً مشترک ہے۔ تیسرا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنیٰ عقدِ تزویج کے ہیں اور وطی کے لیے اس کو مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اور چوتھا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنیٰ وطی کے ہیں اور عقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ثُبوت میں ہر گروہ نے کلامِ عرب سے شواہد پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن راغب اصفہانیؒ نے پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ اصل النکاح العقد ثم استعیر للجماع ومحال ان یکون فی الاصل للجماع ثم استعیر للعقد۔ ''لفظِ نکاح کے اصل معنیٰ عقد ہی کے ہیں۔ پھر یہ لفظ استعارتاً جماع کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اصل معنیٰ جماع کے ہوں اور استعارے کے طور پر اسے عقد کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔'' اِس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جتنے الفاظ بھی جماع کے لیے عَرَبی زبان، یا دنیا کی کسی دوسری زبان میں حقیقتاً وضع کیے گئے ہیں وہ سب فُحش ہیں۔ کوئی شریف آدمی کسی مہذب مجلس میں ان کو زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لفظ حقیقتاً اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہو اسے کوئی معاشرہ شادی بیاہ کے لیے مجاز و استعارے کے طور پر استعمال کرے۔ اس معنیٰ کو ادا کرنے کے لیے تو دنیا کی ہر زبان میں مہذَّب الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں نہ کہ فحش الفاظ۔

جہاں تک قرآن اور سنت کا تعلق ہے، ان میں نکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد یا تو مجرّد عقد ہے، یا پھر وطی بعدِ عقد۔ لیکن وطی بلا عقد کے لیے اس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی وطی کو تو قرآن اور سنت زنا اور سفاح کہتے ہیں نہ کہ نکاح۔

۸۶ – یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالبًا اسی زمانے میں طلاق کا کوئی مسئلہ پیدا ہو جانے پر نازل ہوئی تھی، اس لیے پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کے سلسلۂ بیان کے درمیان اس کو رکھ دیا گیا۔ اس ترتیب سے یہ بات خود مُترشّح ہوتی ہے کہ یہ تقریرِ ماسبق کے بعد اور تقریرِ مابعد سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

QuranUrdu.com

اِس آیت سے جو قانونی احکام نکلتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- آیت میں اگرچہ "مومن عورتوں" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے بظاہر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ کتابی عورتوں کے معاملے میں قانون وہ نہیں ہے جو یہاں بیان ہوا ہے، لیکن تمام علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ معناً یہی حکم کتابیات کے بارے میں بھی ہے۔ یعنی کتابی عورت سے بھی کسی مسلمان نے نکاح کیا ہو تو اس کی طلاق، اس کے مَہر، اس کی عدّت اور اس کو مُتعۂ طلاق دینے کے جملہ احکام وہی ہیں جو مومن عورت سے نکاح کی صورت میں ہیں۔ علما کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مخصوص طور پر صرف مومن عورتوں کا ذکر جو کیا ہے اس سے مقصود دراصل اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مسلمانوں کے لیے مومن عورتیں ہی موزوں ہیں۔ یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ضرور ہے مگر مناسب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے اس اندازِ بیان سے یہ بات مُتَرشّح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہلِ ایمان سے متوقع یہی ہے کہ وہ مومن عورتوں سے نکاح کریں گے۔

۲- "ہاتھ لگانے" یا "مَس" کرنے سے مراد لغت کے اعتبار سے تو محض چھونا ہے، لیکن یہاں یہ لفظ کنایتاً مباشرت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ظاہرِ آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر شوہر نے مباشرت نہ کی ہو تو خواہ وہ عورت کے پاس تنہائی میں رہا ہو، بلکہ اسے ہاتھ بھی لگا چکا ہو تب بھی طلاق دینے کی صورت میں عدّت لازم نہ آئے۔ لیکن فقہانے بر سبیلِ احتیاط یہ حکم لگایا ہے کہ اگر خَلْوَتِ صحیحہ ہو جائے (یعنی جس میں مباشرت ممکن ہو) تو اس کے بعد طلاق دینے کی صورت میں عدّت لازم آئے گی اور سقوطِ عدّت صرف اُس حالت میں ہو گا جب کہ خَلْوَت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔

۳- طلاق قبلِ خَلْوَت کی صورت میں عدّت ساقط ہو جانے کے معنٰی یہ ہیں کہ اس صورت میں مرد کا حقِ رُجوع باقی نہیں رہتا اور عورت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نکاح کر لے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حکم صرف طلاق قبلِ خلوت کا ہے۔ اگر خلوت سے پہلے عورت کا شوہر مر جائے تو اس صورت میں عدّتِ وفات ساقط نہیں ہوتی بلکہ عورت کو وہی چار مہینے دس دن کی عدّت گزارنی ہوتی ہے جو منکوحۂ مدخولہ کے لیے واجب ہے۔ (عدّت سے مراد وہ مدت ہے جس کے گزرنے سے پہلے عورت کے لیے دوسرا نکاح جائز نہ ہو۔)

۴- مَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ (تمھارے لیے ان پر کوئی عدّت لازم نہیں ہے) کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ عدّت عورت پر مرد کا حق ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ صرف مرد ہی کا حق ہے۔ دراصل اس میں دو حق اور بھی شامل ہیں: ایک، حقِ اولاد۔ دوسرے، حق اللہ یا حق الشرع۔ مرد کا حق وہ اس بنا ہے کہ اس دَوران میں اُس کو رُجوع کر لینے کا حق ہے، نیز اس بنا پر کہ اس کی اولاد کے نسب کا ثبوت اس بات پر منحصر ہے کہ عدّت کے زمانے میں عورت کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہو جائے۔ اولاد کا حق اس میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے باپ سے بچے کے نسب کا ثابت ہونا اس کے قانونی حُقوق قائم ہونے کے لیے ضروری ہے اور اس کے اَخلاقی مرتبے کا انحصار بھی اس امر پر ہے کہ اس کا نسب مُشْتَبَہ نہ ہو۔ پھر اس میں حق اللہ (یا حق الشرع) اس لیے شامل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کی پروانہ بھی ہو تو خدا کی شریعت ان حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو یہ پروانہ بھی لکھ کر دے دے

QuranUrdu.com

کہ میرے مرنے کے بعد یا مجھ سے طلاق لے لینے کے بعد تیرے اُوپر میری طرف سے کوئی عدّت واجب نہ ہوگی تب بھی شریعت کسی حال میں اس کو ساقط نہ کرے گی۔

۵- فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (ان کو کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو)۔اس حکم کا منشا دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر پورا کرنا ہوگا۔ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر کیا گیا تھا اور پھر خَلْوَت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اس صورت میں نصف مہر دینا واجب ہوگا، جیسا کہ سورۂ بَقَرہ کی آیت ۲۳۷ میں ارشاد ہوا ہے۔اس واجب سے زائد کچھ دینا لازم نہیں ہے مگر مستحب ہے۔ مثلاً یہ بات پسندیدہ ہے کہ نصف مہر دینے کے ساتھ مرد وہ جوڑا بھی عورت کے پاس ہی رہنے دے جو دُلھن بننے کے لیے اسے بھیجا گیا تھا، یا اور کچھ سامان اگر شادی کے موقع پر اسے دیا گیا تھا تو وہ واپس نہ لے۔لیکن اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرنا واجب ہے، اور یہ ''کچھ نہ کچھ'' آدمی کی حیثیت اور مَقْدِرَت کے مطابق ہونا چاہیے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں فرمایا گیا ہے۔ علما کا ایک گروہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ مُتعۂ طلاق دینا بہرحال واجب ہے خواہ مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ (اسلامی فقہ کی اصطلاح میں مُتعۂ طلاق اُس مال کو کہتے ہیں جو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت عورت کو دیا جاتا ہے۔)

۶- بھلے طریقے سے رخصت کرنے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے بلکہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی تُھکّا فضیحتی کے بغیر شریفانہ طریقے سے عَلیحدگی اختیار کر لی جائے۔ ایک آدمی کو اگر عورت پسند نہیں آئی ہے یا کوئی اور وجہِ شکایت پیدا ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ اس عورت کو نہیں رکھنا چاہتا تو بھلے آدمیوں کی طرح اسے طلاق دے اور رخصت کر دے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کے عُیوب لوگوں کے سامنے بیان کرے اور اپنی شکایتوں کے دفتر کھولے تاکہ کوئی دوسرا بھی اس عورت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن کے اس ارشاد سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ معلّق کرنا خدائی تشریع کی حکمت و مَصْلَحَت کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس صورت میں ''بھلے طریقے سے رخصت کرنے'' کا کوئی امکان نہیں رہتا، بلکہ مرد نہ بھی چاہے تو تُھکّا فضیحتی اور بدنامی و رُسوائی ہو کر رہتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں اس امر کی کوئی گنجایش بھی نہیں ہے کہ مرد کا اختیارِ طلاق کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط ہو۔ آیت بالکل صراحت کے ساتھ ناکح کو طلاق کا اختیار دے رہی ہے اور اسی پر یہ ذمّہ داری ڈال رہی ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگانے سے پہلے عورت کو چھوڑنا چاہے تو لازماً نصف مَہْر دے کر یا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال دے کر چھوڑے۔ اس سے آیت کا مقصود صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کو کھیل بننے سے روکنے کے لیے مرد پر مالی ذمہ داری کا ایک بوجھ ڈال دیا جائے تاکہ وہ خود ہی اپنے اختیارِ طلاق کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور دو خاندانوں کے اندرونی معاملے میں کسی بیرونی مداخلت کی نوبت نہ آنے پائے، بلکہ شوہر سرے سے کسی کو یہ بتانے پر مجبور ہی نہ ہو کہ وہ بیوی کو کیوں چھوڑ رہا ہے۔

۷- ابنِ عباسؓ، سعید بن المُسَیِّبؒ، حَسَن بصریؒ، علی بن الحسین (زین العابدینؒ)، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل نے آیت کے الفاظ ''جب تم نکاح کرو پھر طلاق دے دو'' سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق اُسی صورت میں واقع ہوتی ہے جب کہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا ہو۔ نکاح سے پہلے طلاق بے اثر ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص یوں کہے کہ ''اگر میں فُلاں عورت سے، یا فلاں قبیلے یا قوم

QuranUrdu.com

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ

اَے نبیؐ! ہم نے تمھارے لیے حلال کر دیں تمھاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں، [۸۷]

کی عورت سے، یا کسی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے"، تو یہ قول لغو و بے معنیٰ ہے، اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوسکتی۔ اس خیال کی تائید میں یہ احادیث پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: لا طلاق لابن ادم فی مالا یملك، "ابنِ آدم جس چیز کا مالک نہیں ہے اُس کے بارے میں طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا" (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ) اور لا طلاق قبل النکاح، "نکاح سے پہلے کوئی طلاق نہیں۔" (ابنِ ماجہ) مگر فقہا کی ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ اِس آیت اور اِن احادیث کا اطلاق صرف اِس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک غیر عورت کو جو اس کے نکاح میں نہ ہو یوں کہے کہ "تجھ پر طلاق ہے" یا "میں نے تجھے طلاق دی"۔ یہ قول بلاشبہ لغو ہے جس پر کوئی قانونی نتیجہ مُترَتّب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ یوں کہے کہ "اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھ پر طلاق ہے" تو یہ نکاح سے پہلے طلاق دینا نہیں ہے بلکہ دراصل وہ شخص اس امر کا فیصلہ اور اعلان کرتا ہے کہ جب وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی تو اس پر طلاق وارد ہوگی۔ یہ قول لغو و بے اثر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ جب بھی وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی اُسی وقت اُس پر طلاق پڑ جائے گی۔ یہ مسلک جن فقہا کا ہے ان کے درمیان پھر اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس نوعیت کے ایقاعِ طلاق کی وسعت کس حد تک ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام زُفَرؒ کہتے ہیں کہ خواہ کوئی شخص عورت یا قوم یا قبیلے کی تخصیص کرے یا مثال کے طور پر عام بات اس طرح کہے کہ "جس عورت سے بھی میں نکاح کروں اس پر طلاق ہے"، دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہوجائے گی۔ ابوبکر جصّاصؒ نے یہی رائے حضرت عمرؓ، عبداللہؓ بن مسعود، ابراہیم النخعی، مجاہد اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ سے بھی نقل کی ہے۔

سُفیان ثَوریؒ اور عثمان اَلبَتّیؒ کہتے ہیں کہ طلاق صرف اُسی صورت میں پڑے گی جب کہنے والا یوں کہے کہ "اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے۔"

حسن بن صالحؒ، لَیث بن سعد اور عامر الشَّعبیؒ کہتے ہیں کہ اس طرح کی طلاق عُمومیّت کے ساتھ بھی پڑسکتی ہے بشرطیکہ اس میں کسی نوع کی تخصیص ہو۔ مثلاً آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں فلاں خاندان، یا فلاں قبیلے، یا فلاں شہر یا ملک یا قوم کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے۔"

ابنِ ابی لیلیٰ اور امام مالکؒ اوپر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مزید شرط یہ لگاتے ہیں کہ اس میں مدّت کا بھی تعیُّن ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں اس سال یا آیندہ دس سال کے اندر فلاں عورت یا فلاں گروہ کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے" تب یہ طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں۔ بلکہ امام مالکؒ اس پر اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ اگر یہ مدّت اتنی طویل ہو جس میں اس شخص کا زندہ رہنا متوقع نہ ہو تو اس کا قول بے اثر رہے گا۔

۸۷ – یہ دراصل جواب ہے ان لوگوں کے اعتراض کا جو کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے لوگوں کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع قرار دیتے ہیں، مگر خود انھوں نے یہ پانچویں بیوی کیسے کرلی۔ اس اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ

QuranUrdu.com

وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ؗ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ

اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمھاری مِلکیّت میں آئیں، اور تمھاری وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے، اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبیؐ اسے نکاح میں لینا چاہے۔[۸۸] یہ رعایت خالصتاً تمھارے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے

حضرت زینبؓ سے نکاح کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیویاںؓ موجود تھیں۔ایک، حضرت سَودَہؓ جن سے ۳ قبلِ ہجرت میں آپؐ نے نکاح کیا تھا۔ دوسری، حضرت عائشہؓ جن سے نکاح تو ۳ قبلِ ہجرت میں ہو چکا تھا مگر ان کی رخصتی شوال ۱ھ میں ہوئی تھی۔ تیسری، حضرت حَفصہؓ جن سے شعبان ۳ھ میں آپؐ کا نکاح ہوا۔ اور چوتھی، حضرت اُمِّ سَلَمہؓ جنھیں حضورؐ نے شوال ۴ھ میں زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ اس طرح حضرت زینبؓ آپؐ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر کفار و منافقین جو اعتراض کر رہے تھے اُس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دے رہا ہے کہ اے نبیؐ! تمھاری یہ پانچوں بیویاں جنھیں مہر دے کر تم اپنے نکاح میں لائے ہو، ہم نے تمھارے لیے حلال کی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے چار کی قید لگانے والے بھی ہم ہی ہیں اور اپنے نبی کو اس قید سے مستثنیٰ کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔ اگر وہ قید لگانے کے ہم مجاز تھے تو آخر اس استثنا کے مجاز ہم کیوں نہیں ہیں۔

اس جواب کے بارے میں یہ بات پھر ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ اس سے مقصود کفار و منافقین کو مطمئن کرنا نہیں تھا بلکہ ان مسلمانوں کو مطمئن کرنا تھا جن کے دلوں میں مخالفینِ اسلام وسوسے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں چونکہ یقین تھا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نازل ہوا ہے، اس لیے قرآن کی ایک مُحکم آیت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ نبیؐ نے چار بیویوں کے عام قانون سے اپنے آپ کو خود مستثنیٰ نہیں کر لیا ہے بلکہ یہ استثنا کا فیصلہ ہمارا کیا ہوا ہے۔

۸۸ – پانچویں بیوی کو حضورؐ کے لیے حلال کرنے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضورؐ کو چند مزید اقسام کی عورتوں سے بھی نکاح کی اجازت عطا فرمائی:

۱– وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپؐ کی مِلکیّت میں آئیں۔ اس اجازت کے مطابق حضورؐ نے غزوۂ بنی قُرَیظہ کے سَبایا میں سے حضرت ریحانہؓ، غزوۂ بنی المُصطَلِق کے سبایا میں سے حضرت جُوَیریہؓ، غزوۂ خیبر کے سبایا میں سے حضرت صَفیہؓ اور مُقوقِس مصر کی بھیجی ہوئی حضرت ماریہ قبطیہؓ کو اپنے لیے مخصوص فرمایا۔ ان میں سے مُقدَّم الذکر تین کو آپؐ نے آزاد

QuranUrdu.com

الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَ

نہیں ہے۔[۸۹] ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حُدُود عائد کیے ہیں۔(تمھیں ان حُدُود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے) تا کہ تمھارے اُوپر کوئی تنگی نہ رہے،[۹۰] اور

کر کے ان سے نکاح کیا تھا، لیکن حضرت ماریہؓ سے بَربِنائے مِلکِ یمین تمتُّع فرمایا، ان کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا ہو۔

۲- آپؐ کی چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں میں سے وہ خواتین جنھوں نے ہجرت میں آپؐ کا ساتھ دیا ہو۔ آیت میں آپؐ کے ساتھ ''ہجرت کرنے'' کا جو ذکر آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہجرت کے سفر میں آپؐ کے ساتھ رہی ہوں، بلکہ یہ تھا کہ وہ بھی اسلام کی خاطر راہِ خدا میں ہجرت کر چکی ہوں۔ حضورؐ کو اختیار دیا گیا کہ اِن رشتہ دار مہاجر خواتین میں سے بھی آپؐ جس سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس اجازت کے مطابق آپؐ نے ۷ھ میں حضرت اُمِّ حَبیبہؓ سے نکاح فرمایا۔ (ضمناً اس آیت میں یہ صراحت بھی ہے کہ چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹیاں ایک مسلمان کے لیے حلال ہیں۔ اس معاملے میں اسلامی شریعت عیسائی اور یہودی، دونوں مذہبوں سے مختلف ہے۔ عیسائیوں کے ہاں کسی ایسی عورت سے نکاح نہیں ہوسکتا جس سے سات پشت تک مرد کا نسب ملتا ہو۔ اور یہودیوں کے ہاں سگی بھانجی اور بھتیجی تک سے نکاح جائز ہے۔)

۳- وہ مومن عورت جو اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہِبہ کرے، یعنی بلا مہر اپنے آپ کو حضورؐ کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہو اور حضورؐ اسے قبول کرنا پسند فرمائیں۔ اس اجازت کی بنا پر آپؐ نے شوال ۷ھ میں حضرت میمونہؓ کو اپنی زوجیت میں لیا۔ لیکن آپؐ نے یہ پسند نہ کیا کہ مہر کے بغیر اُن کے ہِبہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ اس لیے آپؐ نے ان کی کسی خواہش اور مطالبے کے بغیر ان کو مہر عطا فرمایا۔ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے نکاح میں کوئی موہوبہ بیوی نہ تھیں۔ مگر اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپؐ نے ہبہ کرنے والی بیوی کو بھی مہر دیے بغیر نہ رکھا۔

۸۹- اس فقرے کا تعلق اگر صرف قریب کے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ دوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت اپنے آپ کو اس کے لیے ہِبہ کرے اور وہ بلا مہر اس سے نکاح کر لے۔ اور اگر اس کا تعلق اُوپر کی پوری عبارت سے مانا جائے تو اس سے مراد یہ ہو گی کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی رعایت بھی صرف حضورؐ کے لیے ہے، عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کچھ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں جن میں اُمت کے دوسرے لوگ آپؐ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ قرآن و سنت کے تتبُّع سے ایسے متعدّد احکام کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لیے نمازِ تہجُّد فرض تھی اور باقی تمام امت کے لیے وہ نفل ہے۔ آپؐ کے لیے اور آپؐ کے خاندان والوں کے لیے صدقہ لینا حرام ہے اور کسی دوسرے کے لیے وہ حرام نہیں ہے۔ آپؐ کی میراث تقسیم نہ ہوسکتی تھی، باقی سب کی میراث کے لیے وہ احکام ہیں جو سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔ آپؐ کے لیے چار سے

QuranUrdu.com

زائد بیویاں حلال کی گئیں، بیویوں کے درمیان عدل آپؐ پر واجب نہیں کیا گیا، اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر نکاح کرنے کی آپؐ کو اجازت دی گئی، اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی بیویاں تمام اُمت پر حرام کر دی گئیں۔ ان میں سے کوئی خصوصیّت بھی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ کے علاوہ کسی مسلمان کو حاصل ہو۔ مفسرین نے آپؐ کی ایک خُصوصیّت یہ بھی بیان کی ہے کہ آپؐ کے لیے کتابیہ عورت سے نکاح ممنوع تھا، حالانکہ باقی امت کے لیے وہ حلال ہے۔

۹۰ – یہ وہ مَصْلَحَت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام قاعدے سے مستثنٰی فرمایا۔ ’’تنگی نہ رہے‘‘ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ! آپؐ کی خواہشاتِ نفسانی بہت بڑھی ہوئی تھیں اس لیے آپؐ کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت دے دی گئی، تاکہ آپؐ صرف چار بیویوں تک محدود رہنے میں تنگی محسوس نہ فرمائیں۔ اس فقرے کا یہ مطلب صرف وہی شخص لے سکتا ہے جو تعصب میں اندھا ہو کر اس بات کو بھول جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۵ سال کی عمر میں ایک ایسی خاتون سے شادی کی تھی جن کی عمر اُس وقت ۴۰ سال تھی، اور پورے ۲۵ برس تک آپؐ ان کے ساتھ نہایت خوش گوار اِزدِواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر جب اُن کا انتقال ہو گیا تو آپؐ نے ایک اور سِنّ رسیدہ خاتون حضرت سَودَہؓ سے نکاح کیا اور پورے چار سال تک تنہا وہی آپؐ کی بیوی رہیں۔ اب آخر کون صاحبِ عقل اور ایمان دار آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ۵۳ سال کی عمر سے گزر جانے کے بعد یکایک حضورؐ کی خواہشاتِ نفسانی بڑھتی چلی گئیں اور آپؐ کو زیادہ سے زیادہ بیویوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ دراصل ’’تنگی نہ رہے‘‘ کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایک طرف تو اُس کارِ عظیم کو نگاہ میں رکھے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اوپر ڈالی تھی اور دوسری طرف ان حالات کو سمجھے جن میں یہ کارِ عظیم انجام دینے کے لیے آپؐ کو مامور کیا گیا تھا۔ تعصب سے ذہن کو پاک کر کے جو شخص بھی ان دونوں حقیقتوں کو سمجھ لے گا، وہ بخوبی جان لے گا کہ بیویوں کے معاملے میں آپؐ کو کُھلی اجازت دینا کیوں ضروری تھا، اور چار کی قید میں آپؐ کے لیے کیا ’’تنگی‘‘ تھی۔

حضورؐ کے سُپرد جو کام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ ایک اَن گھڑ قوم کو جو اسلامی نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ عام تہذیب وتمدُّن کے نقطہ نظر سے بھی ناتراشیدہ تھی، ہر شعبۂ زندگی میں تعلیم وتربیَت دے کر ایک اعلیٰ درجے کی مہذب وشایستہ اور پاکیزہ قوم بنائیں۔ اس غرض کے لیے صرف مردوں کو تربیت دینا کافی نہ تھا، بلکہ عورتوں کی تربیت بھی اتنی ہی ضروری تھی۔ مگر جو اُصُولِ تمدن وتہذیب سکھانے کے لیے آپؐ مامور کیے گئے تھے اُن کی رُو سے مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اِختِلاط ممنوع تھا اور اس قاعدے کو توڑے بغیر آپؐ کے لیے عورتوں کو براہِ راست خود تربیت دینا ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر عورتوں میں کام کرنے کی صرف یہی ایک صورت آپؐ کے لیے ممکن تھی کہ مختلف عمروں اور ذہنی صلاحیتوں کی متعدّد خواتین سے آپؐ نکاح کریں، ان کو براہِ راست خود تعلیم وتربیَت دے کر اپنی مدد کے لیے تیار کریں، اور پھر اُن سے شہری اور بَدْوی اور جوان اور ادھیڑ اور بوڑھی، ہر قسم کی عورتوں کو دین سکھانے اور اَخلاق وتہذیب کے نئے اصول سمجھانے کا کام لیں۔

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی تھی کہ پرانے جاہلی نظامِ زندگی کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کر دیں۔ اس خدمت کی انجام دِہی میں جاہلی نظام کے عَلَم برداروں سے جنگ ناگزیر تھی۔ اور یہ کشمکش ایک ایسے ملک میں پیش آ رہی تھی جہاں قبائلی طرزِ زندگی اپنی مخصوص رِوایات کے ساتھ رائج تھا۔ ان حالات میں دوسری تدابیر کے ساتھ آپؐ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ آپؐ مختلف خاندانوں میں نکاح کر کے بہت سی دوستیوں کو پختہ اور بہت سی عداوتوں کو ختم کر دیں۔ چنانچہ

QuranUrdu.com

كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۰﴾ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ
مَنْ تَشَآءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ

اللہ غفور ورحیم ہے۔ تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو، اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلا لو۔ اس معاملے میں تم پر کوئی مضایقہ نہیں ہے۔

جن خواتین سے آپؐ نے شادیاں کیں ان کے ذاتی اوصاف کے علاوہ ان کے انتخاب میں یہ مَصلَحت بھی کم وبیش شامل تھی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حَفصہؓ کے ساتھ نکاح کر کے آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ اپنے تعلقات کو اور زیادہ گہرا اور مستحکم کرلیا۔ حضرت اُمِّ سَلَمہؓ اُس خاندان کی بیٹی تھیں جس سے ابوجہل اور خالدؓ بن ولید کا تعلق تھا۔ اور حضرت اُمِّ حَبِیبَہؓ ابوسُفیان کی بیٹی تھیں۔ ان شادیوں نے بہت بڑی حد تک اِن خاندانوں کی دشمنی کا زور توڑ دیا، بلکہ اُمِّ حبیبہؓ کے ساتھ حضورؐ کا نکاح ہونے کے بعد تو ابوسفیان پھر کبھی حضورؐ کے مقابلے پر نہ آیا۔ حضرت صَفِیہؓ اور رَیحانہؓ یہودی خاندانوں سے تھیں۔ انھیں آزاد کر کے جب حضورؐ نے ان سے نکاح کیے تو آپؐ کے خلاف یہودیوں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ کیونکہ اُس زمانے میں عَرَبی رِوایات کے مطابق جس شخص سے کسی قبیلے کی بیٹی بیاہی جاتی تھی وہ صرف لڑکی کے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پورے قبیلے کا داماد سمجھا جاتا تھا، اور داماد سے لڑنا بڑے عار کی بات تھی۔

معاشرے کی عملی اصلاح اور اس کی جاہلانہ رُسوم کو توڑنا بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ چنانچہ ایک نکاح آپؐ کو اِس مقصد کے لیے بھی کرنا پڑا، جیسا کہ اسی سورۂ احزاب میں مفصّل بیان ہو چکا ہے۔

یہ مَصلحتیں اس بات کی مقتضی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رکھی جائے۔ تاکہ جو کارِ عظیم آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا اُس کی ضروریات کے لحاظ سے آپؐ جتنے نکاح کرنا چاہیں کرلیں۔

اِس بیان سے اُن لوگوں کے خیال کی غَلَطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ تعدّدِ ازواج صرف چند خاص شخصی ضرورتوں کی خاطر ہی جائز ہے اور اُن کے ماسوا کوئی غرض ایسی نہیں ہو سکتی جس کے لیے یہ جائز ہو۔ ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک سے زائد نکاح کیے ان کی وجہ یہ نہ تھی کہ بیوی بیمار تھی، یا بانجھ تھی، یا اولادِ نرینہ نہ تھی، یا کچھ یتیموں کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان محدود شخصی ضروریات کے بغیر آپؐ نے تمام نکاح یا تو تبلیغی و تعلیمی ضروریات کے لیے کیے، یا اصلاحِ معاشرہ کے لیے، یا سیاسی واجتماعی مقاصد کے لیے۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ نے خود تعدّدِ ازواج کو اُن چند گنی چُنی مخصوص اغراض تک، جن کا آج نام لیا جا رہا ہے، محدود نہیں رکھا، اور اللہ کے رسولؐ نے اُن کے سوا بہت سے دوسرے مقاصد کے لیے متعدّد نکاح کیے، تو کوئی دوسرا شخص کیا حق رکھتا ہے کہ قانون میں اپنی طرف سے چند قیُود تجویز کرے اور اُوپر سے دعویٰ یہ کرے کہ یہ حد بندیاں وہ شریعت کے مطابق کر رہا ہے۔ دراصل ان ساری حد بندیوں کی جڑ یہ مغربی تخیّل ہے کہ تعدّدِ ازواج بجائے خود ایک برائی ہے۔ اسی تخیّل کی بنا پر یہ نظریّہ پیدا ہوا ہے کہ یہ فعلِ حرام اگر کبھی حلال ہو بھی ہو سکتا ہے تو صرف شدید ناگزیر ضروریات کے لیے ہو سکتا ہے۔ اب اس درآمد شدہ تخیّل پر اسلام کا جَعلی ٹھپّا لگانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے،

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَ لَا يَحْزَنَّ وَ يَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا

اِس طرح زیادہ متوقّع ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی، اور جو کچھ بھی تم اُن کو دو گے اس پر وہ سب راضی رہیں گی۔[91] اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے، اور اللہ علیم و

قرآن وسنت اور پوری اُمتِ مسلمہ کا لٹریچر اس سے قطعاً ناآشنا ہے۔

۹۱ - اس آیت سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خانگی زندگی کی الجھنوں سے نجات دلانا تھا تاکہ آپؐ پورے سُکون کے ساتھ اپنا کام کر سکیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں حضورؐ کو پورے اختیارات دے دیے کہ ازواجِ مطہراتؓ میں سے جس کے ساتھ جو برتاؤ چاہیں کریں تو اس بات کا کوئی امکان نہ رہا کہ یہ مومن خواتین آپؐ کو کسی طرح پریشان کرتیں یا آپس میں مُسابقت اور رقابت کے جھگڑے پیدا کر کے آپؐ کے لیے اُلجھنیں پیدا کرتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ اختیار پا لینے کے بعد بھی حضورؐ نے تمام ازواج کے درمیان پورا پورا عدل فرمایا، کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی، اور باقاعدہ باری مقرر کر کے آپؐ سب کے ہاں تشریف لے جاتے رہے۔ محدثین میں سے صرف ابو رَزِینؒ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے صرف چار بیویوں (حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت اُمِّ سَلَمہؓ) کو باریوں کی تقسیم میں شامل کیا تھا اور باقی ازواج کے لیے کوئی باری مقرر نہ کی تھی۔ لیکن دوسرے تمام محدثین و مفسرین اس کی تردید کرتے ہیں اور نہایت قوی رِوایات سے اس امر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس اختیار کے بعد بھی حضورؐ تمام ازواج کے ہاں باری باری سے جاتے تھے اور سب سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ بخاری، مسلم، نَسائی اور ابوداؤد وغیرہم حضرت عائشہؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ''اس آیت کے نزول کے بعد بھی حضورؐ کا طریقہ یہی رہا کہ آپؐ ہم میں سے کسی بیوی کی باری کے دن دوسری بیوی کے ہاں جاتے تو اس سے اجازت لے کر جاتے تھے۔'' ابوبکر جصّاص عُروہ بن زبیرؓ کی رِوایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باریوں کی تقسیم میں ہم میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ اگرچہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ کسی روز اپنی سب بیویوں کے ہاں نہ جاتے ہوں، مگر جس بیوی کی باری کا دن ہوتا تھا اس کے سوا کسی دوسری بیوی کو چھوتے تک نہ تھے۔'' اور یہ رِوایت بھی حضرت عائشہؓ ہی کی ہے کہ جب حضورؐ اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہوئے اور نقل و حرکت آپؐ کے لیے مُشکل ہو گئی تو آپؐ نے سب بیویوں سے اجازت طَلب کی کہ مجھے عائشہؓ کے ہاں رہنے دو، اور جب سب نے اجازت دے دی تب آپؐ نے آخری زمانہ حضرت عائشہؓ کے ہاں گزارا۔ ابنِ ابی حاتمؒ امام زُہریؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بیوی کو باری سے محروم کرنا ثابت نہیں ہے۔ اس سے صرف حضرت سَودہؓ مستثنیٰ ہیں جنھوں نے خود اپنی باری بخوشی حضرت عائشہؓ کو بخش دی تھی، کیونکہ وہ بہت سِنّ رسیدہ ہو چکی تھیں۔

اس مَقام پر کسی کے دل میں یہ شبہ نہ رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ اس آیت میں اپنے نبی کے ساتھ کوئی بے جا رعایت کی تھی اور ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ فرمایا تھا۔ دراصل جن عظیم مصالح کی خاطر نبیؐ کو بیویوں کی تعداد

QuranUrdu.com

حَلِيۡمًا ﴿۵۱﴾ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ وَلَاۤ اَنۡ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكَ حُسۡنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُكَ ؕ

حلیم ہے۔[۹۲] اس کے بعد تمھارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں، اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ اُن کا حُسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو،[۹۳] البتہ لونڈیوں کی تمھیں اجازت ہے۔[۹۴]

کے معاملے میں عام قاعدے سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، انھی مصالح کا تقاضا یہ بھی تھا کہ آپؐ کو خانگی زندگی کا سکون بہم پہنچایا جائے اور اُن اسباب کا سدِّ باب کیا جائے جو آپؐ کے لیے پریشان خاطری کے موجب ہو سکتے ہوں۔ ازواجِ مطہراتؓ کے لیے یہ ایک بہت بڑا شرف تھا کہ انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بزرگ ترین ہستی کی زوجیت حاصل ہوئی اور اس کی بدولت اُن کو یہ موقع نصیب ہوا کہ دعوت و اصلاح کے اُس عظیم الشان کام میں آپؐ کی رفیقِ کار بنیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بننے والا تھا۔ اس مقصد کے لیے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر معمولی ایثار و قربانی سے کام لے رہے تھے اور تمام صحابۂ کرامؓ اپنی حدِ استطاعت تک قربانیاں کر رہے تھے اسی طرح ازواجِ مطہراتؓ کا بھی یہ فرض تھا کہ ایثار سے کام لیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کو تمام ازواجِ رسولؐ نے بخوشی قبول کیا۔

۹۲- یہ تنبیہ ہے ازواجِ مطہراتؓ کے لیے بھی اور دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی۔ ازواجِ مطہراتؓ کے لیے تنبیہ اس بات کی ہے کہ اللہ کا یہ حکم آ جانے کے بعد اگر وہ دل میں بھی کبیدہ خاطر ہوں گی تو گرفت سے نہ بچ سکیں گی۔ اور دوسرے لوگوں کے لیے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِزدِواجی زندگی کے متعلق کسی طرح کی بدگمانی بھی اگر انھوں نے اپنے دل میں رکھی یا فکر و خیال کے کسی گوشے میں بھی کوئی وسوسہ پالتے رہے تو اللہ سے ان کی یہ چوری چھپی نہ رہ جائے گی۔ اس کے ساتھ اللہ کی صفتِ حِلْم کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ نبیؐ کی شان میں گستاخی کا تخیل بھی اگرچہ سخت سزا کا مُستَوجِب ہے، لیکن جس کے دل میں کبھی ایسا کوئی وسوسہ آیا ہو وہ اگر اسے نکال دے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی کی اُمید ہے۔

۹۳- اس ارشاد کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ جو عورتیں اوپر آیت نمبر ۵۰ میں حضورؐ کے لیے حلال کی گئی ہیں ان کے سوا دوسری کوئی عورت اب آپؐ کے لیے حلال نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جب آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ اس بات کے لیے راضی ہو گئی ہیں کہ تنگی و ترشی میں آپؐ کا ساتھ دیں اور آخرت کے لیے دنیا کو انھوں نے تج دیا ہے، اور اس پر بھی خوش ہیں کہ آپؐ جو برتاؤ بھی ان کے ساتھ چاہیں کریں، تو اب آپؐ کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی اور بیوی لے آئیں۔

۹۴- یہ آیت اس امر کی صراحت کر رہی ہے کہ منکوحہ بیویوں کے علاوہ مملوکہ عورتوں سے بھی تمتُّع کی اجازت ہے اور ان کے لیے تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ اسی مضمون کی تصریح سورۂ نساء آیت ۳، سورۂ مومنون آیت ۶، اور سورۂ معارج آیت ۳۰ میں بھی کی گئی ہے۔ ان تمام آیات میں مملوکہ عورتوں کو منکوحہ ازواج کے بالمقابل ایک الگ صِنف کی حیثیت سے بیان

QuranUrdu.com

ع ۴ ۱۲ ۳

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا
بُيُوْتَ النَّبِىِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ

اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ ع

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، نبیؐ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ ۹۵ نہ کھانے کا وقت

کیا گیا ہے اور پھر ان کے ساتھ اِزدِواجی تعلق کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ نیز سورۂ نساء کی آیت ۳ منکوحہ بیویوں کے لیے چار کی حد مقرر کرتی ہے، مگر نہ اُس جگہ اللہ تعالیٰ نے مملوکہ عورتوں کے لیے تعداد کی حد مقرر کی ہے اور نہ دوسری متعلقہ آیات میں ایسی کسی حد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ بلکہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ کے لیے اس کے بعد دوسری عورتوں سے نکاح کرنا، یا موجودہ بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لانا تو حلال نہیں ہے، البتہ مملوکہ عورتیں حلال ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مملوکہ عورتوں کے معاملے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کی شریعت یہ گنجایش مال دار لوگوں کو بے حساب لونڈیاں خرید خرید کر عیاشی کرنے کے لیے دیتی ہے۔ دراصل یہ تو ایک بے جا فائدہ ہے جو نفس پرست لوگوں نے قانون سے اُٹھایا ہے۔ قانون بجائے خود انسانوں کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا، اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ لوگ اس سے یہ فائدہ اُٹھائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے شریعت ایک مرد کو چار تک بیویاں کرنے کی اجازت دیتی ہے، اور اسے یہ حق بھی دیتی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لے آئے۔ یہ قانون انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا تھا۔ اب اگر کوئی شخص محض عیاشی کی خاطر یہ طریقہ اختیار کرے کہ چار بیویوں کو کچھ مدت رکھ کر طلاق دیتا اور پھر ان کی جگہ بیویوں کی دوسری کھیپ لاتا چلا جائے، تو یہ قانون کی گنجایشوں سے ناروا فائدہ اُٹھانا ہے جس کی ذمہ داری خود اسی شخص پر عائد ہوگی نہ کہ خدا کی شریعت پر۔ اسی طرح شریعت نے جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو، جب کہ ان کی قوم مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ کرنے یا فِدیہ دے کر اُن کو چھڑانے کے لیے تیار نہ ہو، لونڈی بنانے کی اجازت دی، اور جن اشخاص کی مِلکیّت میں وہ حکومت کی طرف سے دے دی جائیں اُن کو یہ حق دیا کہ ان عورتوں سے تمتّع کریں، تاکہ اُن کا وجود معاشرے کے لیے اَخلاقی فساد کا سبب نہ بن جائے۔ پھر چونکہ لڑائیوں میں گرفتار ہونے والے لوگوں کی کوئی تعداد مُعیّن نہیں ہوسکتی تھی اس لیے قانوناً اس امر کی بھی حد معیّن نہیں کی جاسکتی تھی کہ ایک شخص بیک وقت کتنے غلام اور کتنی لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ لونڈیوں اور غلاموں کی خرید وفروخت کو بھی اس بنا پر جائز رکھا گیا کہ اگر کسی لونڈی یا غلام کا نباہ ایک مالک سے نہ ہوسکے تو وہ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل ہوسکے اور ایک ہی شخص کی دائمی ملکیت مالک ومملوک دونوں کے لیے عذاب نہ بن جائے۔ شریعت نے یہ سارے قواعد انسانی حالات وضروریات کو ملحوظ رکھ کر سہولت کی خاطر بنائے تھے۔ اگر ان کو مال دار لوگوں نے عیاشی کا ذریعہ بنا لیا تو اس کا الزام انھی پر ہے نہ کہ شریعت پر۔

۹۵ — یہ اُس حکمِ عام کی تمہید ہے جو تقریباً ایک سال کے بعد سورۂ نُور کی آیت ۲۷ میں دیا گیا۔ قدیم زمانے میں

QuranUrdu.com

اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى النَّبِىَّ فَيَسْتَحْيٖ

تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمھیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔[96] مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔[97] تمھاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں

اہلِ عرب بے تکلّف ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے ملنا ہوتا تو وہ دروازے پر کھڑے ہو کر پکارنے اور اجازت لے کر اندر جانے کا پابند نہ تھا۔ بلکہ اندر جا کر عورتوں اور بچّوں سے پوچھ لیتا تھا کہ صاحبِ خانہ گھر میں ہے یا نہیں۔ یہ جاہلانہ طریقہ بہت سی خرابیوں کا موجب تھا۔ اور بسا اوقات اس سے بہت گھناؤنے اخلاقی مفاسد کا بھی آغاز ہو جاتا تھا۔ اس لیے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ کوئی شخص، خواہ وہ قریبی دوست یا دُور پرے کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، آپؐ کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ پھر سورۂ نور میں اس قاعدے کو تمام مسلمانوں کے گھروں میں رائج کرنے کا عام حکم دے دیا گیا۔

۹۶ — یہ اس سلسلے کا دوسرا حکم ہے۔ جو غیر مہذّب عادات اہلِ عرب میں پھیلی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کسی دوست یا ملاقاتی کے گھر کھانے کا وقت تاک کر پہنچ جاتے۔ یا اس کے گھر آ کر بیٹھے رہتے یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو جائے۔ اس حرکت کی وجہ سے صاحبِ خانہ اکثر عجیب مشکل میں پڑ جاتا تھا۔ منہ پھوڑ کر کہے کہ میرے کھانے کا وقت ہے، آپ تشریف لے جائیے، تو بے مُروّتی ہے۔ کھلائے تو آخر اچانک آئے ہوئے کتنے آدمیوں کو کھلائے۔ ہر وقت ہر آدمی کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ جب جتنے آدمی بھی اس کے ہاں آ جائیں، ان کے کھانے کا انتظام فوراً کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے ہودہ عادت سے منع فرمایا اور حکم دے دیا کہ کسی شخص کے گھر کھانے کے لیے اُس وقت جانا چاہیے جب کہ گھر والا کھانے کی دعوت دے۔ یہ حکم صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے لیے خاص نہ تھا بلکہ اُس نمونے کے گھر میں یہ قواعد اسی لیے جاری کیے گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں عام تہذیب کے ضابطے بن جائیں۔

۹۷ — یہ ایک اور بے ہودہ عادت کی اصلاح ہے۔ بعض لوگ کھانے کی دعوت میں بلائے جاتے ہیں تو کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپس میں گفتگو کا ایسا سلسلہ چھیڑ دیتے ہیں جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انھیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ صاحبِ خانہ اور گھر کے لوگوں کو اس سے کیا زحمت ہوتی ہے۔ ناشایستہ لوگ اپنی اس عادت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تنگ کرتے رہتے تھے اور آپؐ اپنے اخلاقِ کریمانہ کی وجہ سے اس کو برداشت کرتے تھے۔ آخر کار حضرت زینبؓ کے ولیمے کے روز یہ حرکت اذیت رسانی کی حد سے گزر گئی۔ حضورؐ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ بن مالک کی رِوایت ہے کہ رات کے وقت ولیمے کی دعوت تھی۔ عام لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے، مگر دو تین حضرات بیٹھ کر باتیں کرنے میں لگ گئے۔ تنگ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے اور ازواجِ مطہراتؓ کے ہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپؐ پھر

QuranUrdu.com

مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا
فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ
وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ

کہتے۔اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔[98] تمھارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو،[99] اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے

پلٹ گئے اور حضرت عائشہؓ کے حُجرے میں جا بیٹھے۔اچھی خاصی رات گزر جانے پر جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں تب آپؐ حضرت زینبؓ کے مکان میں تشریف لائے۔اس کے بعد ناگزیر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ خود ان بُری عادات پر لوگوں کو مُتنبہ فرمائے۔حضرت اَنسؓ کی رِوایت کے مطابق یہ آیات اسی موقع پر نازل ہوئی تھیں۔(مسلم، نَسائی، ابنِ جَریر)

۹۸- یہی آیت ہے جس کو آیتِ حجاب کہا جاتا ہے۔بخاری میں حضرت اَنسؓ بن مالک کی رِوایت ہے کہ حضرت عمرؓ اس آیت کے نزول سے پہلے متعدّد مرتبہ حضوؐر سے عرض کر چکے تھے کہ یا رسولؐ اللہ! آپ کے ہاں بھلے اور بُرے سب ہی قسم کے لوگ آتے ہیں۔کاش! آپ اپنی ازواجِ مطہراتؓ کو پردہ کرنے کا حکم دے دیتے۔ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ازواجِ رسولؐ سے کہا کہ ''اگر آپ کے حق میں میری بات مانی جائے تو کبھی میری نگاہیں آپ کو نہ دیکھیں۔'' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قانون سازی میں خود مختار نہ تھے، اِس لیے آپؐ اشارۂ الٰہی کے منتظر رہے۔آخر کار یہ حکم آ گیا کہ مَحْرَم مردوں کے سوا (جیسا کہ آگے آیت ۵۵ میں آ رہا ہے) کوئی مرد حضوؐر کے گھر میں نہ آئے، اور جس کو بھی خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے۔اس حکم کے بعد ازواجِ مطہراتؓ کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکا دیے گئے، اور چونکہ حضوؐر کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا، اس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔آیت کا آخری فقرہ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ بھی مردوں اور عورتوں کے دل پاک رکھنا چاہیں، انھیں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اب جس شخص کو بھی خدا نے بینائی عطا کی ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جو کتاب مردوں کو عورتوں سے رُو دَر رُو بات کرنے سے روکتی ہے، اور پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مَصلَحت یہ بتاتی ہے کہ ''تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے''، اُس میں سے آخر یہ نرالی روح کیسے کشید کی جا سکتی ہے کہ مخلوط مجالس اور مخلوط تعلیم اور جُمہوری ادارات اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کا بے تکلّف میل جول بالکل جائز ہے اور اس سے دلوں کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔کسی کو قرآن کی پیروی نہ کرنی ہو تو اس کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرے اور صاف صاف کہے کہ میں اس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔لیکن یہ تو بڑی ہی ذلیل حرکت ہے کہ وہ قرآن کے صریح احکام کی خلاف ورزی بھی کرے اور پھر ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی کہے

QuranUrdu.com

مِنۡۢ بَعۡدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمۡ كَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمًا ﴿۵۳﴾ اِنۡ تُبۡدُوۡا
شَيۡـًٔا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴿۵۴﴾ لَا جُنَاحَ
عَلَيۡهِنَّ فِىۡۤ اٰبَآئِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآئِهِنَّ وَلَاۤ اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ
اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتۡ
اَيۡمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيۡنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا ﴿۵۵﴾

نکاح کرو،[۱۰۰] یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم[۱۰۱] ہے۔

ازواجِ نبیؐ کے لیے اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے،[۱۰۲] ان کے میل جول کی عورتیں[۱۰۳] اور ان کے مملوک[۱۰۴] گھروں میں آئیں۔ (اے عورتو!) تمھیں اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔[۱۰۵]

کہ یہ اسلام کی ''روح'' ہے جو میں نے نکال لی ہے۔ آخر وہ اسلام کی کون سی روح ہے جو قرآن وسنت کے باہر کسی جگہ ان لوگوں کو مل جاتی ہے؟

۹۹ — یہ اشارہ ہے اُن الزام تراشیوں کی طرف جو اس زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کی جا رہی تھیں اور کفار و منافقین کے ساتھ بعض ضعیف الایمان مسلمان بھی ان میں حصہ لینے لگے تھے۔

۱۰۰ — یہ تشریح ہے اُس ارشاد کی جو آغازِ سورہ میں گزر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اہلِ ایمان کی مائیں ہیں۔

۱۰۱ — یعنی اگر حضورؐ کے خلاف دل میں بھی کوئی بُرا خیال کوئی شخص رکھے گا، یا آپؐ کی ازواج کے متعلق کسی کی نیت میں بھی کوئی بُرائی چھپی ہوگی، تو اللہ تعالیٰ سے وہ چھپی نہ رہے گی اور وہ اس پر سزا پائے گا۔

۱۰۲ — تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور حواشی نمبر ۳۸ تا ۴۲۔ اس سلسلے میں علامہ آلوسیؒ کی یہ تشریح بھی قابلِ ذکر ہے کہ ''بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کے حکم میں وہ سب رشتہ دار آجاتے ہیں جو ایک عورت کے لیے حرام ہوں، خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا رضاعی۔ اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلۂ والدین ہیں۔ یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کردیا گیا کہ بھانجوں اور بھتیجوں کا ذکر آجانے کے بعد اُن کے ذکر کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ بھی ہے۔'' (روح المعانی)

QuranUrdu.com

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ
وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۸﴾ ع

اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر دُرود بھیجتے ہیں،[۱۰۶] اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر دُرود و سلام بھیجو۔[۱۰۷]

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیّت دیتے ہیں ان پر دُنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور اُن کے لیے رُسوا کُن عذاب مہیّا کر دیا ہے۔[۱۰۸] اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیّت دیتے ہیں اُنھوں نے ایک بڑے بہتان[۱۰۹] اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔ ع

---

۱۰۳ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ نمبر ۴۳۔

۱۰۴ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفسیر سورۂ نور، حاشیہ نمبر ۴۴۔

۱۰۵ – اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس حکمِ قطعی کے آ جانے کے بعد آیندہ کسی ایسے شخص کو گھروں میں بے حجاب آنے کی اجازت نہ دی جائے جو اِن مستثنیٰ رشتہ داروں کے دائرے سے باہر ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ خواتین کو یہ رَوِش ہرگز نہ اختیار کرنی چاہیے کہ وہ شوہر کی موجودگی میں تو پردے کی پابندی کریں مگر جب وہ موجود نہ ہو تو غیر محرم مردوں کے سامنے پردہ اٹھا دیں۔ ان کا یہ فعل چاہے ان کے شوہر سے چھپا رہ جائے، خدا سے تو نہیں چھپ سکتا۔

۱۰۶ – اللہ کی طرف سے اپنے نبی پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپؐ پر بے حد مہربان ہے، آپؐ کی تعریف فرماتا ہے، آپؐ کے کام میں برکت دیتا ہے، آپؐ کا نام بلند کرتا ہے اور آپؐ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرماتا ہے۔ ملائکہ کی طرف سے آپؐ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپؐ سے غایت درجے کی محبّت رکھتے ہیں اور آپؐ کے حق میں اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپؐ کو زیادہ سے زیادہ بلند مرتبے عطا فرمائے، آپؐ کے دین کو سربلند کرے، آپؐ کی شریعت کو فروغ بخشے اور آپؐ کو مقامِ محمود پر پہنچائے۔ سیاق و سباق پر نگاہ ڈالنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ بات کس لیے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا جب دشمنانِ اسلام اس دینِ مبین کے فروغ پر اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے حضورؐ کے خلاف الزامات کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور

QuranUrdu.com

اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کیچڑ اچھال کر وہ آپؐ کے اُس اَخلاقی اثر کو ختم کر دیں گے جس کی بدولت اسلام اور مسلمانوں کے قدم روز بروز بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ان حالات میں یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو یہ بتایا کہ کفار و مشرکین اور منافقین میرے نبی کو بدنام کرنے اور نیچا دکھانے کی جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں، آخرِ کار وہ منہ کی کھائیں گے، اس لیے کہ میں اس پر مہربان ہوں اور ساری کائنات کا نظم و نسق جن فرشتوں کے ذریعے سے چل رہا ہے وہ سب اس کے حامی اور ثنا خواں ہیں۔ وہ اس کی مَذمّت کر کے کیا پا سکتے ہیں جب کہ میں اس کا نام بلند کر رہا ہوں اور میرے فرشتے اس کی تعریفوں کے چرچے کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اوچھے ہتھیاروں سے اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں جب کہ میری رحمتیں اور برکتیں اس کے ساتھ ہیں اور میرے فرشتے شب و روز دعا کر رہے ہیں کہ ربّ العالمین! محمدؐ کا مرتبہ اور زیادہ اونچا کر اور اس کے دین کو اور زیادہ فروغ دے۔

۱۰۷- دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اے لوگو جن کو محمدؐ رسول اللہ کی بدولت راہِ راست نصیب ہوئی ہے، تم ان کی قدر پہچانو اور ان کے احسانِ عظیم کا حق ادا کرو۔ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، اس شخص نے تمھیں علم کی روشنی دی۔ تم اَخلاق کی پستیوں میں گرے ہوئے تھے، اس شخص نے تمھیں اُٹھایا اور اس قابل بنایا کہ آج محسودِ خلائق بنے ہوئے ہو۔ تم وحشت اور حیوانیت میں مبتلا تھے، اس شخص نے تم کو بہترین انسانی تہذیب سے آراستہ کیا۔ کفر کی دنیا اسی لیے اس شخص پر خار کھا رہی ہے کہ اس نے یہ احسانات تم پر کیے، ورنہ اس نے کسی کے ساتھ ذاتی طور پر کوئی بُرائی نہ کی تھی۔ اس لیے اب تمھاری احسان شناسی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جتنا بُغض وہ اس خیرِ مجسّم کے خلاف رکھتے ہیں اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ محبّت تم اس سے رکھو، جتنی وہ اس سے نفرت کرتے ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے گرویدہ ہو جاؤ، جتنی وہ اس کی مَذمّت کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کی تعریف کرو، جتنے وہ اس کے بدخواہ ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے خیر خواہ بنو اور اس کے حق میں وہی دعا کرو جو اللہ کے فرشتے شب و روز اس کے لیے کر رہے ہیں کہ اے ربِّ دو جہاں! جس طرح تیرے نبیؐ نے ہم پر بے پایاں احسانات فرمائے ہیں، تو بھی ان پر بے حد و بے حساب رحمت فرما، ان کا مرتبہ دُنیا میں بھی سب سے زیادہ بلند کر اور آخرت میں بھی انھیں تمام مُقرّبین سے بڑھ کر تقرّب عطا فرما۔

اس آیت میں مسلمانوں کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے: ایک، صَلُّوْا عَلَيْهِ۔ دوسرے، سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

صَلوٰۃ کا لفظ جب عَلیٰ کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے تین معنیٰ ہوتے ہیں: ایک، کسی پر مائل ہونا، اس کی طرف محبّت کے ساتھ متوجہ ہونا اور اُس پر جُھکنا۔ دوسرے، کسی کی تعریف کرنا۔ تیسرے، کسی کے حق میں دعا کرنا۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جائے گا تو ظاہر ہے کہ تیسرے معنیٰ میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ کا کسی اَور سے دعا کرنا قطعاً ناقابلِ تصور ہے۔ اس لیے لامحالہ وہ صرف پہلے دو معنوں میں ہوگا۔ لیکن جب یہ لفظ بندوں کے لیے بولا جائے گا، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، تو وہ تینوں معنوں میں ہوگا۔ اس میں محبّت کا مفہوم بھی ہوگا، مَدح و ثنا کا مفہوم بھی اور دعائے رحمت کا مفہوم بھی۔ لہٰذا اہلِ ایمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صَلُّوْا عَلَيْهِ کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے گرویدہ ہو جاؤ، ان کی مدح و ثنا کرو، اور اُن کے لیے دعا کرو۔

سَلٰمؐ کا لفظ بھی دو معنیٰ رکھتا ہے: ایک، ہر طرح کی آفات اور نقائص سے محفوظ رہنا، جس کے لیے ہم اُردو میں سلامتی کا لفظ بولتے ہیں۔ دوسرے، صلح اور عدمِ مخالفت۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کہنے کا ایک مطلب یہ ہے

QuranUrdu.com

کہ تم ان کے حق میں کامل سلامتی کی دعا کرو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح دل و جان سے اُن کا ساتھ دو، اُن کی مُخالفت سے پرہیز کرو، اور ان کے سچے فرماں بردار بن کر رہو۔

یہ حکم جب نازل ہوا تو متعدّد صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! سلام کا طریقہ تو آپؐ ہمیں بتا چکے ہیں (یعنی نماز میں السّلام علیك ایّها النبی و رحمة اللّٰه و برکاتهٗ اور ملاقات کے وقت السّلام علیك یا رسول اللّٰه کہنا) مگر آپؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضورؐ نے بہت سے لوگوں کو مختلف مواقع پر جو درود سکھائے ہیں، وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

کَعب بن عُجرہؓ: اَللّٰھُمَّ صَلِّ علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انك حمیدٌ مجید وبارِكْ علی محمد وعلی اٰلِ محمّد کما بارکت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انك حمید مجید۔ یہ درود تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرت کَعب بن عُجرہؓ سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی، ابنِ ماجہ، امام احمد، ابنِ ابی شَیبہ، عبدالرَّزّاق، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ جَریر نے روایت کیا ہے۔

ابنِ عباسؓ: ان سے بھی بہت خفیف فرق کے ساتھ وہی درود مروی ہے جو اوپر نقل ہوا ہے۔ (ابنِ جَریر)

ابوحُمَید ساعدیؓ: اَللّٰھم صَلِّ علی محمّد وازواجه وذرّیّته کما صلّیت علی ابراھیم وبارك علی محمّد وازواجه وذرّیّته کما بارکت علی اٰل ابراھیم انك حمیدٌ مجید۔ (مالک، احمد، بخاری، مسلم، نَسائی، ابوداؤد، ابنِ ماجہ)

ابومسعود بدریؓ: اَللّٰھم صَلِّ علی محمد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم وبارك علی محمّد وعلی اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم فی العالمین انك حمید مجید۔ (مالک، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نَسائی، احمد، ابنِ جَریر، ابنِ حِبّان، حاکم)

ابوسعید خُدریؓ: اللّٰھمّ صَلِّ علی محمد عبدِك و رسولِك کماصلّیت علی ابراھیم وبارك علی محمّد وعلی اٰلِ محمّد کما بارکت علی ابراھیم۔ (احمد، بخاری، نَسائی، ابن ماجہ)

بُرَیدَہ الخُزاعی: اللّٰھم اجعل صلوٰتك ورحمتك وبرکاتك علی محمد وعلی اٰل محمّدٍ کما جعلتها عَلی ابراھیم انك حمید مجید۔ (احمد، عبد بن حُمَید، ابنِ مَردُوْیَہ)

ابوہُرَیرہؓ: اللّٰھُمّ صل علی محمّد وعلی اٰل محمّدٍ وبارِك علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت و بارکت علی ابراھیم واٰل ابراھیم فی العالمین انك حمید مجید۔ (نَسائی)

طلحہؓ: اللّٰھُمّ صلِّ علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلّیت علی ابراھیم انك حمید مجید وبارك علی محمد وعلی اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم انك حمید مجید۔ (ابنِ جریر)

یہ تمام درود الفاظ کے اختلاف کے باوجود معنیٰ میں متفق ہیں۔ ان کے اندر چند اہم نِکات ہیں جنھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

اوّلاً، ان سب میں حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ مجھ پر درود بھیجنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے

QuranUrdu.com

دُعا کرو کہ اے خدا! تو محمدؐ پر درود بھیج۔ نادان لوگ جنھیں معنیٰ کا شُعور نہیں ہے اس پر فوراً یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ یہ تو عجیب بات ہوئی، اللہ تعالیٰ تو ہم سے فرما رہا ہے کہ تم میرے نبی پر درود بھیجو، مگر ہم الٹا اللہ سے کہتے ہیں کہ تو درود بھیج حالانکہ دراصل اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ تم مجھ پر ''صلوٰۃ'' کا حق ادا کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکتے، اس لیے اللہ ہی سے دعا کرو کہ وہ مجھ پر صلوٰۃ فرمائے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم حضورؐ کے مراتب بلند نہیں کر سکتے، اللہ ہی بلند کر سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے، اللہ ہی ان کا اجر دے سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے رفعِ ذکر کے لیے اور آپؐ کے دین کو فروغ دینے کے لیے خواہ کتنی ہی کوشش کریں، اللہ کے فضل اور اس کی توفیق و تائید کے بغیر اُس میں کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ حتّٰی کہ حضورؐ کی محبّت و عقیدت بھی ہمارے دل میں اللہ ہی کی مدد سے جاگزیں ہو سکتی ہے ورنہ شیطان نہ معلوم کتنے وساوس دل میں ڈال کر ہمیں آپؐ سے منحرف کر سکتا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذالك۔ لہٰذا حضورؐ پر صلوٰۃ کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ سے آپؐ پر صلوٰۃ کی دُعا کی جائے۔ جو شخص اَللّٰھُمَّ صَلِّ علٰی محمّدٍ کہتا ہے وہ گویا اللہ کے حضور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ خدایا! تیرے نبی پر صلوٰۃ کا جو حق ہے اسے ادا کرنا میرے بس میں نہیں ہے، تُو ہی میری طرف سے اس کو ادا کر اور مجھ سے اس کے ادا کرنے میں جو خدمت چاہے لے لے۔

ثانیاً، حضورؐ کی شانِ کرم نے یہ گوارا نہ فرمایا کہ تنہا اپنی ہی ذات کو اس دعا کے لیے مخصوص فرما لیں، بلکہ اپنے ساتھ اپنی آل اور ازواج اور ذُرّیّت کو بھی آپؐ نے شامل کر لیا۔ ازواج اور ذرّیّت کے معنیٰ تو ظاہر ہیں۔ رہا آل کا لفظ، تو وہ محض حضورؐ کے خاندان والوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں وہ سب لوگ آجاتے ہیں جو آپؐ کے پیَرو ہوں اور آپؐ کے طریقے پر چلیں۔ عَرَبی لغت کی رو سے آل اور اہل میں فرق یہ ہے کہ کسی شخص کی آل وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے ساتھی، مددگار اور مُتّبع ہوں، خواہ وہ اس کے رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔ اور کسی شخص کے اہل وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے رشتہ دار ہوں، خواہ وہ اس کے ساتھی اور متبع ہوں یا نہ ہوں۔ قرآنِ مجید میں ۱۴ مقامات پر آلِ فرعون کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان میں سے کسی جگہ بھی آل سے مراد محض فرعون کے خاندان والے نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں اس کے ساتھی تھے۔ (مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: سورۂ بَقرہ آیات ۴۹-۵۰۔ آلِ عمران: ۱۱۔ الاعراف: ۱۳۰۔ المومن: ۴۶) پس آلِ محمدؐ سے ہر وہ شخص خارج ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر نہ ہو، خواہ وہ خاندانِ رسالت ہی کا ایک فرد ہو، اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتا ہو، خواہ وہ حضورؐ سے کوئی دور کا بھی نسبی تعلق نہ رکھتا ہو، البتہ خاندانِ رسالت کے وہ افراد بدرجۂ اَولیٰ آلِ محمدؐ ہیں جو آپؐ سے نسبی تعلق بھی رکھتے ہیں اور آپؐ کے پیرو بھی ہیں۔

ثالثاً، ہر درود جو حضورؐ نے سکھایا ہے اس میں یہ بات ضرور شامل ہے کہ آپؐ پر ویسی ہی مہربانی فرمائی جائے جیسی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر فرمائی گئی ہے۔ اس مضمون کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں علما نے کی ہیں، مگر کوئی تاویل دل کو نہیں لگتی۔ میرے نزدیک صحیح تاویل یہ ہے (والعلم عند اللّٰہ) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر ایک خاص کرم فرمایا ہے جو آج تک کسی پر نہیں فرمایا، اور وہ یہ ہے کہ تمام وہ انسان جو نبوت اور وحی اور کتاب کو ماخذِ ہدایت مانتے ہیں وہ حضرت ابراہیمؑ کی پیشوائی پر متفق ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ لہٰذا نبیؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جس

QuranUrdu.com

طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاءؑ کے پیروؤں کا مَرجَع بنایا ہے، اسی طرح مجھے بھی بنا دے۔ اور کوئی ایسا شخص جو نبوت کا ماننے والا ہو، میری نبوت پر ایمان لانے سے محروم نہ رہ جائے۔

یہ امر کہ حضورؐ پر دُرود بھیجنا سنتِ اسلام ہے، جب آپؐ کا نام آئے اس کا پڑھنا مستحب ہے، اور خُصوصاً نماز میں اس کا پڑھنا مسنون ہے، اس پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے۔ اس امر پر بھی اجماع ہے کہ عمر میں ایک مرتبہ حضورؐ پر درود بھیجنا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اس کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد درود کے مسئلے میں علما کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ نماز میں آخری مرتبہ جب آدمی تشہُّد پڑھتا ہے، اس میں صلوٰۃ علی النبی پڑھنا فرض ہے، اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو نماز نہ ہو گی۔ صحابہؓ میں سے ابنِ مسعودؓ، ابومسعود انصاریؓ، ابنِ عمرؓ، جابرؓ بن عبداللہ، تابعین میں سے شَعبیؒ، امام محمد باقرؒ، محمد بن کعب قُرظیؒ اور مُقاتِل بن حَیّانؒ، اور فقہا میں سے اسحاق بن رَاہوَیہؒ کا بھی یہی مسلک تھا، اور آخر میں امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، اور جُمہور علما کا مسلک یہ ہے کہ درود عمر میں صرف ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ یہ کلمۂ شہادت کی طرح ہے کہ جس نے ایک مرتبہ اللہ کی الٰہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر لیا، اس نے فرض ادا کر دیا۔ اسی طرح جس نے ایک دفعہ درود پڑھ لیا، وہ فریضۂ صلوٰۃ علی النبی سے سَبُک دوش ہو گیا۔ اس کے بعد نہ کلمہ پڑھنا فرض ہے نہ درود۔

ایک اور گروہ نماز میں اس کا پڑھنا مطلقاً واجب قرار دیتا ہے۔ مگر تشہُّد کے ساتھ اس کو مُقیَّد نہیں کرتا۔

ایک دوسرے گروہ کے نزدیک ہر دعا میں اس کا پڑھنا واجب ہے۔ کچھ اور لوگ اس کے قائل ہیں کہ جب بھی حضورؐ کا نام آئے، دُرود پڑھنا واجب ہے۔ اور ایک گروہ کے نزدیک ایک مجلس میں حضورؐ کا ذکر خواہ کتنی ہی مرتبہ آئے، درود پڑھنا بس ایک دفعہ واجب ہے۔

یہ اختلافات صرف وجوب کے معاملے میں ہیں۔ باقی رہی دُرود کی فضیلت، اور اس کا موجبِ اجر وثواب ہونا، اور اس کا ایک بہت بڑی نیکی ہونا، تو اس پر ساری امت متفق ہے۔ اس میں کسی ایسے شخص کو کلام نہیں ہو سکتا جو ایمان سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہو۔ درود تو فطری طور پر ہر اس مسلمان کے دل سے نکلے گا جسے یہ احساس ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بعد ہمارے سب سے بڑے محسن ہیں۔ اسلام اور ایمان کی جتنی قدر انسان کے دل میں ہو گی اتنی ہی زیادہ قدر اس کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کی بھی ہو گی، اور جتنا زیادہ آدمی ان احسانات کا قدر شناس ہو گا اتنا ہی زیادہ وہ حضورؐ پر درود بھیجے گا۔ پس درحقیقت کثرتِ دُرود ایک پیمانہ ہے جو ناپ کر بتا دیتا ہے کہ دینِ محمدؐ سے ایک آدمی کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے اور نعمتِ ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ من صَلّٰی عَلَیَّ صلٰوۃ لم تزل الملٰئکۃ تصلّی علیہ ما صلّٰی عَلَیَّ۔ (احمد و ابنِ ماجہ) ''جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے، ملائکہ اس پر دُرود بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا رہے۔'' من صلّٰی علیّ واحدۃ صلی اللّٰہ علیہ عشرًا۔ (مسلم) ''جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے، اللہ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے۔''

QuranUrdu.com

اولی الناس بی یوم القیامۃ اکثرھم علیّ صلٰوۃ (ترمذی) ''قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا۔'' البخیل الذی ذکرتُ عندہ فلم یصلّ عَلَیّ (ترمذی) بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں کے لیے اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ فلان، یاصلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ـــــ یا اسی طرح کے دوسرے الفاظ کے ساتھ صلٰوۃ جائز ہے یا نہیں، اس میں علما کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ جس میں قاضی عِیاضؒ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اسے مطلقاً جائز رکھتا ہے۔ ان لوگوں کا اِستدلال یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود غیر انبیا پر صلٰوۃ کی متعدّد مقامات پر تصریح کی ہے۔ مثلاً اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ (البقرہ: ۱۵۷) خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِھِمۡ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمۡ وَتُزَکِّیۡھِمۡ بِھَا وَصَلِّ عَلَیۡھِمۡ (التوبہ: ۱۰۳) ھُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ (الاحزاب: ۴۳) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدّد مواقع پر لفظِ صلٰوۃ کے ساتھ غیرِ انبیا کو دُعا دی ہے۔ مثلاً ایک صحابی کے لیے آپؐ نے دعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیٰ اٰل ابی اوفٰی۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی بیوی کی درخواست پر فرمایا: صلی اللّٰہ علیکِ وَعلیٰ زوجِکِ۔ جو لوگ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوتے، ان کے حق میں آپؐ فرماتے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ علیھم۔ حضرت سعدؓ بن عُبادہ کے حق میں آپؐ نے فرمایا، اللّٰھمّ اجعل صَلٰوتك ورحمتك علیٰ اٰل سَعد بن عُبادۃ۔ اور مومن کی روح کے متعلق حضورؐ نے خبر دی کہ ملائکہ اس کے حق میں دعا کرتے ہیں: صلی اللّٰہ علیك وعلیٰ جسدك۔ لیکن جمہورِ امت کے نزدیک ایسا کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے تو دُرست تھا مگر ہمارے لیے درست نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب یہ اہلِ اسلام کا شِعار بن چکا ہے کہ وہ صلٰوۃ وسلام کو انبیا علیہم السلام کے لیے خاص کرتے ہیں، اس لیے غیرِ انبیا کے لیے اس کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ اپنے ایک عامل کو لکھا تھا کہ ''میں نے سنا ہے کچھ واعظین نے یہ نیا طریقہ شروع کیا ہے کہ وہ صلٰوۃ علی النبی کی طرح اپنے سرپرستوں اور حامیوں کے لیے بھی صلٰوۃ کا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ میرا یہ خط پہنچنے کے بعد ان لوگوں کو اس فعل سے روک دو اور انھیں حکم دو کہ وہ صلٰوۃ کو انبیاؑ کے لیے مخصوص رکھیں اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں دعا پر اکتفا کریں۔'' (رُوح المَعانی) اکثریت کا یہ مسلک بھی ہے کہ حضورؐ کے سوا کسی نبی کے لیے بھی ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ کا استعمال درست نہیں ہے۔

۱۰۸ — اللہ کو اذیّت دینے سے مراد دو چیزیں ہیں: ایک، یہ کہ اس کی نافرمانی کی جائے، اس کے مقابلے میں کفر و شرک اور دَہریّت کا رَوِیّہ اختیار کیا جائے، اور اس کے حرام کو حلال کر لیا جائے۔ دوسرے، یہ کہ اس کے رسولؐ کو اذیت دی جائے۔ کیونکہ جس طرح رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اسی طرح رسولؐ پر طعن خدا پر طعن ہے، رسولؐ کی مُخالَفت خدا کی مخالفت ہے، اور رسولؐ کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

۱۰۹ — یہ آیت بہتان کی تعریف متعین کر دیتی ہے، یعنی جو عیب آدمی میں نہ ہو، یا جو قصور آدمی نے نہ کیا ہو، وہ اس کی طرف منسوب کرنا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی کی رِوایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا: غیبت کیا ہے؟ فرمایا: ذکرك اخاك بمَا یکرہ ''تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔'' عرض کیا گیا: اور اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو؟ فرمایا: ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہٗ وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتّہٗ۔ ''اگر

QuranUrdu.com

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ

اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلُّو لٹکا لیا کریں۔[۱۱۰] یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور

اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تُو نے اس کی غیبت کی۔ اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تُو نے اس پر بہتان لگایا۔'' یہ فعل صرف ایک اَخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنے والی ہو۔ بلکہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں بھی جھوٹے الزامات لگانے کو جرم مُستَلزِم سزا قرار دیا جائے۔

۱۱۰ – اصل الفاظ ہیں: يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ۔ جِلباب عَرَبی زبان میں بڑی چادر کو کہتے ہیں۔ اور اِدْنَاء کے اصل معنیٰ قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں، مگر جب اس کے ساتھ عَلیٰ کا صِلہ آئے تو اس میں ارخاء، یعنی اُوپر سے لٹکا لینے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے بعض مترجمین ومفسرین مغربی مذاق سے مغلوب ہو کر اس لفظ کا ترجمہ صرف ''لپیٹ لینا'' کرتے ہیں، تاکہ کسی طرح چہرہ چھپانے کے حکم سے بچ نکلا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا مقصود اگر وہی ہوتا جو یہ حضرات بیان کرنا چاہتے ہیں تو وہ يُدْنِيْنَ اِلَيْهِنَّ فرماتا۔ جو شخص بھی عربی زبان جانتا ہو وہ کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ کے معنیٰ محض لپیٹ لینے کے ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کے الفاظ یہ معنیٰ لینے میں اور زیادہ مانع ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں مِن تبعیض کے لیے ہے، یعنی چادر کا ایک حصہ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ لپیٹی جائے گی تو پوری چادر لپیٹی جائے گی، نہ کہ اس کا محض ایک حصہ۔ اس لیے آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر اُن کا ایک حصّہ، یا ان کا پلّو اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں، جسے عُرفِ عام میں گھونگٹ ڈالنا کہتے ہیں۔

یہی معنیٰ عہدِ رسالت سے قریب ترین زمانے کے اکابر مفسرین بیان کرتے ہیں۔ ابنِ جَرِیر اور ابن المُنْذِر کی روایت ہے کہ محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے حضرت عَبِیدة السَّلمانیؒ سے اس آیت کا مطلب پوچھا۔ (یہ حضرت عَبِیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان ہو چکے تھے مگر حاضرِ خدمت نہ ہو سکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدینہ آئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھیں فقہ اور قضا میں قاضی شُرَیحؒ کا ہم پلّہ مانا جاتا تھا۔) انھوں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی چادر اُٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانک کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔ ابنِ عباسؓ بھی قریب قریب یہی تفسیر کرتے ہیں۔ اُن کے جو اقوال ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ مَرْدُوْیَہ نے نقل کیے ہیں، ان میں وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لیے گھروں سے نکلیں تو اپنی چادروں کے پلّو اوپر سے ڈال کر اپنا منہ چھپا لیں اور صرف آنکھیں کھلی رکھیں۔'' یہی تفسیر قَتَادَہ اور سُدّی نے بھی اس آیت کی بیان کی ہے۔

عہدِ صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد جتنے بڑے بڑے مفسرین تاریخِ اسلام میں گزرے ہیں انھوں نے بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب

QuranUrdu.com

بیان کیا ہے۔امام ابنِ جریر طَبَریؒ کہتے ہیں: یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ، ”یعنی شریف عورتیں اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھروں سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کُھلے ہوئے ہوں، بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصّہ لٹکا لیا کریں، تا کہ کوئی فاسق ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے۔“ (جامع البیان، جلد ۲۲، ص ۳۳)

علّامہ ابوبکر جَصّاصؒ کہتے ہیں: ”یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے اپنا چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت سَتر اور عِفّت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تا کہ مُشتبہ سیرت و کردار کے لوگ اسے دیکھ کر کسی طمع میں مبتلا نہ ہوں۔“ (احکام القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۵۸)

علامہ زَمَخشَریؒ کہتے ہیں: یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ، یعنی ”وہ اپنے اُوپر اپنی چادروں کا ایک حصّہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔“ (الکشّاف، جلد ۲، ص ۲۲۱)

علّامہ نظام الدین نَیشا پُوریؒ کہتے ہیں: یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ، یعنی اپنے اوپر چادر کا ایک حصّہ لٹکا لیں۔اس طرح عورتوں کو سر اور چہرہ ڈھانکنے کا حکم دیا گیا ہے۔“ (غرائب القرآن، جلد ۲۲، ص ۳۲)

امام رازیؒ کہتے ہیں: ”اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدکار عورتیں نہیں ہیں۔کیونکہ جو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی، حالانکہ چہرہ سَتر میں داخل نہیں ہے، اس سے کوئی شخص یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ اپنا ستر غیر کے سامنے کھولنے پر راضی ہوگی۔اس طرح ہر شخص جان لے گا کہ یہ باپردہ عورتیں ہیں، ان سے زنا کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔“ (تفسیرِ کبیر، جلد ۶، ص ۵۹۱)

ضمناً ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: ”اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو۔“ یہ الفاظ اُن لوگوں کے قول کی قطعی تردید کر دیتے ہیں جو خدا سے بے خوف ہو کر بے تکلُّف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی صُلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ گیلڑ تھیں۔یہ لوگ تعصّب میں اندھے ہو کر یہ بھی نہیں سوچتے کہ اولادِ رسولؐ کے نسب سے انکار کر کے وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اِس کی کیسی سخت جواب دِہی انھیں آخرت میں کرنی ہوگی۔تمام معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خَدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ ہی نہ تھیں بلکہ تین اور بیٹیاں بھی تھیں۔حضورؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاقؒ حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”ابراہیمؑ کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد انھی کے بطن سے پیدا ہوئی اور ان کے نام یہ ہیں: قاسمؓ، اور طاہرؓ و طَیِّبؓ، اور زینبؓ، اور رُقیّہؓ اور اُمِّ کلثومؓ اور فاطمہؓ۔“ (سیرت ابنِ ہِشام، جلد اول، ص ۲۰۲) مشہور ماہرِ علمِ اَنساب ہِشام بن محمد بن السّائب کَلبی کا بیان ہے کہ: ”مکہ میں نبوت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے، پھر زینبؓ، پھر رُقیّہؓ، پھر اُمِّ کلثومؓ۔(طَبَقاتِ ابنِ سَعد، جلد اول، ص ۱۳۳) ابنِ حَزمؒ نے جوامع السیرۃ میں لکھا ہے کہ حضرت خَدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی چار لڑکیاں تھیں۔سب سے بڑی حضرت زینبؓ، ان سے چھوٹی رُقیّہؓ، ان سے چھوٹی فاطمہؓ، اور ان سے چھوٹی اُمِّ کلثومؓ۔(ص ۳۸-۳۹) طَبَریؒ، ابنِ سَعدؒ، ابوجعفر محمد بن حبیبؒ صاحب کتابُ المُحبَّر اور ابنِ عبدالبرؒ صاحب کتاب الاِستیعاب، مستند حوالوں سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے دو شوہر گزر چکے تھے۔ایک ابوہالہ تمیمی جس سے ان کے ہاں ہندؓ بن ابوہالہ پیدا ہوئے۔دوسرے عتیق بن عائذ مخزومی جس سے ان کے ہاں ایک

QuranUrdu.com

فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۵۹﴾ لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ
الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ
لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿ۖۛ۶۰﴾

نہ ستائی جائیں [۱۱۱]۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے [۱۱۲]۔

اگر منافقین، اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے [۱۱۳]، اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں [۱۱۴]، اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمھیں اُٹھا کھڑا کریں گے، پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمھارے ساتھ رہ سکیں گے۔

لڑکی ہند نامی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کا نکاح حضورؐ سے ہوا اور تمام علمائے انساب متفق ہیں کہ آپؐ کی صُلب سے ان کے ہاں وہ چاروں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام اُوپر مذکور ہوئے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: طَبَری، جلد ۲، ص ۴۱۱ طَبَقاتِ ابنِ سعد، جلد ۸، ص ۱۴ تا ۱۶۔ کتاب المُحَبَّر، ص ۷۸، ۷۹، ۴۵۲۔ الاِستیعاب جلد ۲، ص ۷۱۸) اِن تمام بیانات کو قرآنِ مجید کی یہ تصریح قطعی الثبوت بنا دیتی ہے کہ حضورؐ کی ایک ہی صاحبزادی نہ تھیں بلکہ کئی صاحبزادیاں تھیں۔

۱۱۱ – ”پہچان لی جائیں“ سے مراد یہ ہے کہ ان کو اس سادہ اور حیادار لباس میں دیکھ کر ہر دیکھنے والا جان لے کہ وہ شریف اور باعِصمت عورتیں ہیں، آوارہ اور کھلاڑی نہیں ہیں کہ کوئی بدکردار انسان ان سے اپنے دل کی تمنّا پوری کرنے کی اُمید کر سکے۔ ”نہ ستائی جائیں“ سے مراد یہ ہے کہ ان کو نہ چھیڑا جائے، ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

اس مقام پر ذرا ٹھیر کر یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ قرآن کا یہ حکم، اور وہ مقصدِ حکم جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان کر دیا ہے، اسلامی قانونِ معاشرت کی کیا روح ظاہر کر رہا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نور، آیت ۳۱ میں یہ ہدایت گزر چکی ہے کہ عورتیں اپنی آرایش و زیبایش کو فلاں فلاں قسم کے مردوں اور عورتوں کے سوا کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ ”اور زمین پر پاؤں مارتی ہوئی بھی نہ چلیں کہ لوگوں کو اُس زینت کا علم ہو جو انھوں نے چھپا رکھی ہے۔“ اُس حکم کے ساتھ اگر سورۂ احزاب کی اِس آیت کو ملا کر پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں چادر اوڑھنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے اس کا منشا اجنبیوں سے زینت چھپانا ہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ منشا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب کہ چادر بجائے خود سادہ ہو، ورنہ ایک مُزَیَّن اور جاذِبِ نظر کپڑا لپیٹ لینے سے تو یہ منشا اُلٹا اور فوت ہو جائے گا۔ اس پر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ صرف چادر لپیٹ کر زینت چھپانے ہی کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ یہ بھی فرما رہا ہے کہ عورتیں چادر کا ایک حصہ اپنے اُوپر سے لٹکا لیا کریں۔ کوئی معقول آدمی اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں لے سکتا کہ اس سے مقصود گھونگٹ ڈالنا ہے تاکہ جسم و لباس کی زینت چھپنے کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی چُھپ جائے۔ پھر اس حکم کی عِلّت اللہ تعالیٰ خود یہ بیان فرماتا ہے کہ یہ وہ مناسب ترین طریقہ ہے جس سے یہ مسلمان خواتین پہچان لی جائیں گی اور اذیت سے محفوظ رہیں گی۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر

QuranUrdu.com

ہو جاتی ہے کہ یہ ہدایت اُن عورتوں کو دی جا رہی ہے جو مردوں کی چھیڑ چھاڑ اور ان کی نظر بازی اور ان کے شہوانی اِلتفات سے لذت اندوز ہونے کے بجائے اس کو اپنے لیے تکلیف دِہ اور اذیت ناک محسوس کرتی ہیں، جو معاشرے میں اپنے آپ کو آبرو باختہ شمعِ انجمن قسم کی عورتوں میں شمار نہیں کرانا چاہتیں، بلکہ عفت مآب چراغِ خانہ ہونے کی حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہیں۔ ایسی شریف اور نیک خواتین سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم فی الواقع اس حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہو اور مردوں کی ہوس ناک توجُّہات حقیقت میں تمھارے لیے موجبِ لذت نہیں بلکہ موجب اذیت ہیں تو پھر اس کے لیے مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ تم خوب بناؤ سنگھار کر کے پہلی رات کی دلھن بن کر گھروں سے نکلو اور دیکھنے والوں کی حریص نگاہوں کے سامنے اپنا حُسن اچھی طرح نکھار نکھار کر پیش کرو، بلکہ اس غرض کے لیے تو مناسب ترین طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ تم ایک سادہ چادر میں اپنی ساری آرایش و زیبایش کو چھپا کر نکلو، اپنے چہرے پر گھونگٹ ڈالو، اور اس طرح چلو کہ زیور کی جھنکار بھی لوگوں کو تمھاری طرف متوجہ نہ کرے۔ جو عورت باہر نکلنے سے پہلے بن ٹھن کر تیار ہوتی ہے اور اس وقت تک گھر سے قدم نہیں نکالتی جب تک سات سنگھار نہ کرلے، اس کی غرض اس کے سوا آخر اَور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ دنیا بھر کے مردوں کے لیے اپنے آپ کو جنت نگاہ بنانا چاہتی ہے اور انھیں خود دعوتِ التفات دیتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ یہ کہتی ہے کہ دیکھنے والوں کی بھوکی نگاہیں اسے تکلیف دیتی ہیں، اس کے بعد اگر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ''معاشرے کی بیگم'' اور ''مقبولِ عام خاتون'' ہونے کی حیثیت سے معروف نہیں ہونا چاہتی بلکہ عفت مآب گھر گرہستَن بن کر رہنا چاہتی ہے تو یہ ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ انسان کا قول اس کی نیت متعین نہیں کرتا بلکہ اس کی اصل نیت وہ ہوتی ہے جو اس کے عمل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا جو عورت جاذبِ نظر بن کر غیر مردوں کے سامنے جاتی ہے اس کا یہ عمل خود ظاہر کردیتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے فتنے کے طالب لوگ اس سے وہی توقعات وابستہ کرتے ہیں جو ایسی عورت سے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ قرآن عورتوں سے کہتا ہے کہ تم بیک وقت چراغِ خانہ اور شمعِ انجمن نہیں بن سکتی ہو۔ چراغِ خانہ بننا ہے تو اُن طور طریقوں کو چھوڑ دو جو شمعِ انجمن بننے کے لیے موزوں ہیں، اور وہ طرزِ زندگی اختیار کرو جو چراغِ خانہ بننے میں مددگار ہوسکتا ہے۔

کسی شخص کی ذاتی رائے خواہ قرآن کے موافق ہو یا اس کے خلاف، اور وہ قرآن کی ہدایت کو اپنے لیے ضابطۂ عمل کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے، بہرحال اگر وہ تعبیر کی بددیانتی کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ قرآن کا منشا سمجھنے میں غَلَطی نہیں کرسکتا۔ وہ اگر منافق نہیں ہے تو صاف صاف یہ مانے گا کہ قرآن کا منشا وہی ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو خلاف ورزی بھی وہ کرے گا یہ تسلیم کر کے کرے گا کہ وہ قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے یا قرآن کی ہدایت کو غلط سمجھتا ہے۔

۱۱۲ – یعنی پہلے جاہلیّت کی حالت میں جو غلطیاں کی جاتی رہی ہیں اللہ اپنی مہربانی سے ان کو معاف کردے گا، بشرطیکہ اب صاف صاف ہدایت مل جانے کے بعد تم اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلو اور جان بُوجھ کر اس کی خلاف ورزی نہ کرو۔

۱۱۳ – ''دل کی خرابی'' سے مراد یہاں دو قسم کی خرابیاں ہیں: ایک یہ کہ آدمی اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کا بدخواہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آدمی بدنیتی، آوارگی اور مجرمانہ ذہنیت میں مبتلا ہو اور اس کے ناپاک رجحانات اس کی حرکات و سکنات سے پُھوٹے پڑتے ہوں۔

۱۱۴ – اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانے اور ان کے حوصلے پست کرنے کے لیے آئے دن

QuranUrdu.com

مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ
فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ رکوع
يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَمَا
يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ
اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا

ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بُری طرح مارے جائیں گے۔ یہ اللہ کی سنّت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آ رہی ہے، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔[115]

لوگ تم سے پُوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی۔[116] کہو: اُس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ تمھیں کیا خبر، شاید کہ وہ قریب ہی آ لگی ہو۔ بہرحال یہ یقینی امر ہے کہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیّا کر دی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کوئی حامی و مددگار

مدینے میں اس طرح کی خبریں اڑایا کرتے تھے کہ فُلاں جگہ مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی ہے اور فُلاں جگہ مسلمانوں کے خلاف بڑی طاقت جمع ہو رہی ہے اور عنقریب مدینے پر اچانک حملہ ہونے والا ہے۔ اس کے ساتھ اُن کا ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ وہ خاندانِ نبوت اور شرفائے مسلمین کی خانگی زندگی کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑتے اور پھیلاتے تھے تاکہ اس سے عوام میں بدگمانیاں پیدا ہوں اور مسلمانوں کے اَخلاقی اثر کو نقصان پہنچے۔

۱۱۵ – یعنی یہ اللہ کی شریعت کا ایک مستقل ضابطہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے اور ریاست میں اس طرح کے مفسدین کو کبھی پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ جب بھی کسی معاشرے اور ریاست کا نظام خدائی شریعت پر قائم ہوگا اُس میں ایسے لوگوں کو پہلے مُتنبّہ کر دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی روش بدل دیں، اور پھر جب وہ باز نہ آئیں گے تو سختی کے ساتھ ان کا اِستیصال کر ڈالا جائے گا۔

۱۱۶ – رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال عُموماً کفار و منافقین کیا کرتے تھے۔ اور اس سے ان کا مقصد علم حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ دل لگی اور اِستہزا کے طور پر یہ بات پوچھا کرتے تھے۔ دراصل ان کو آخرت کے آنے کا یقین نہ تھا۔ قیامت کے تصور کو وہ محض ایک خالی خولی دھمکی سمجھتے تھے۔ وہ قیامت کے آنے کی تاریخ اس لیے دریافت نہیں کرتے تھے کہ اس کے آنے سے پہلے وہ اپنے معاملات درست کر لینے کا ارادہ رکھتے ہوں، بلکہ ان کا اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے

QuranUrdu.com

وَّلَا نَصِيْرًا ۚ ﴿۶۵﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ
اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا
وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ
الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا ع ۸ ۵
تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ

نہ پاسکیں گے۔ جس روز ان کے چہرے آگ پر اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے، اُس وقت وہ کہیں گے کہ ”کاش! ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔“ اور کہیں گے: ”اے رب ہمارے! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہمیں راہِ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب! ان کو دُہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔“[117] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو،[118] اُن لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنھوں نے موسیٰؑ کو اذیّتیں دی تھیں، پھر اللہ نے اُن کی بنائی ہوئی باتوں سے اُس کی براءت فرمائی اور وہ

تمھیں نیچا دکھانے کے لیے یہ کچھ کیا ہے اور آج تک تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہو، اب ذرا ہمیں بتاؤ تو سہی کہ آخر وہ قیامت کب برپا ہوگی جب ہماری خبر لی جائے گی۔

۱۱۷- یہ مضمون قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں: اَعراف: ۱۸۷۔ النازعات: ۴۲-۴۶۔ سبا: ۳۱۔ الملک: ۲۵-۲۷۔ المطفّفین، ۱۰-۱۷۔ الحِجر: ۲-۳۔ الفرقان: ۲۷-۲۹۔ حٰم السجدہ: ۲۷-۲۹۔

۱۱۸- یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ قرآنِ مجید میں ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو“ کے الفاظ سے کہیں تو سچّے اہلِ ایمان کو خطاب کیا گیا ہے، اور کہیں مسلمانوں کی جماعت بحیثیتِ مجموعی مخاطَب ہے جس میں مومن اور منافق اور ضعیف الایمان سب شامل ہیں، اور کہیں رُوئے سُخن خالص منافقین ہی کی طرف ہے۔ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر جب مخاطَب کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ان کو شرم دلانا ہوتا ہے کہ تم لوگ دعویٰ تو ایمان لانے کا کرتے ہو اور حرکتیں تمھاری یہ کچھ ہیں۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے ہر جگہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد کون لوگ ہیں۔ یہاں سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ مخاطب عام مسلمان ہیں۔

QuranUrdu.com

وَكَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ وَجِيۡهًا ؕ‏ ﴿۶۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ
وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا ۙ‏ ﴿۷۰﴾ يُّصۡلِحۡ لَـكُمۡ اَعۡمَالَـكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ
ذُنُوۡبَكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ﴿۷۱﴾ اِنَّا
عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ
يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا

اللہ کے نزدیک با عزّت[119] تھا۔ اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمھارے اعمال دُرست کر دے گا اور تمھارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے، اُس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اُسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اُٹھا لیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور

۱۱۹– دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اے مسلمانو! تم یہودیوں کی سی حرکتیں نہ کرو۔ تمھاری روش اپنے نبیؐ کے ساتھ وہ نہ ہونی چاہیے جو بنی اسرائیل کی رَوِش موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی۔'' بنی اسرائیل خود مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ ان کے سب سے بڑے محسن تھے۔ جو کچھ بھی یہ قوم بنی، انھی کی بدولت بنی۔ ورنہ مصر میں اس کا انجام ہندوستان کے شُودروں سے بھی بدتر ہوتا۔ لیکن اپنے اس مُحسنِ اعظم کے ساتھ اس قوم کا جو سلوک تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے بائبل کے حسبِ ذیل مقامات پر صرف ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے:

کتابِ خُروج۔ ۵: ۲۰-۲۱۔ ۱۴: ۱۱-۱۲۔ ۱۶: ۲-۳۔ ۱۷: ۳-۴۔

کتابِ گنتی۔ ۱۱: ۱-۱۵۔ ۱۴: ۱-۱۰۔ ۱۶ مکمل۔ ۲۰: ۲-۵۔

قرآنِ مجید بنی اسرائیل کی اسی مُحسن کُشی کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو مُتنبّہ کر رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچو، ورنہ پھر اُسی انجام کے لیے تیار ہو جاؤ جو یہودی دیکھ چکے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔

یہی بات متعدّد مواقع پر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمائی ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں میں کچھ مال تقسیم کر رہے تھے۔ اس مجلس سے جب لوگ باہر نکلے تو ایک شخص نے کہا: ''محمدؐ نے اس تقسیم میں خدا اور آخرت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا۔'' یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سُن لی اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آج آپؐ پر یہ باتیں بنائی گئی ہیں۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: رحمة اللّٰه علی موسٰی فانهٗ اُوذی باکثر من هٰذا فصبر ''اللہ کی رحمت ہو موسیٰؑ پر۔ انھیں اس سے زیادہ اذیتیں دی گئیں اور

QuranUrdu.com

جَهُوۡلًا ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ
وَالۡمُشۡرِكٰتِ وَيَتُوۡبَ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۷۳﴾ ع

ع ۹ ۵ ۶

جاہل ہے۔[۱۲۰] اِس بارِ امانت کو اُٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ منافق مَردوں اور عورتوں، اور مُشرک مَردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مَردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے، اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ ع

انھوں نے صبر کیا۔" (مُسنَدِ احمد، ترمذی، ابوداؤد)

۱۲۰ — کلام کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے اور اس حیثیت میں ہوتے ہوئے اگر وہ دنیا کی زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ کر بے فکری کے ساتھ غلط رَوِیّہ اختیار کرتا ہے تو کس طرح اپنے ہاتھوں خود اپنا مستقبل خراب کرتا ہے۔

اس جگہ "امانت" سے مراد وہی "خلافت" ہے جو قرآنِ مجید کی رُو سے انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت و مَعصِیَت کی جو آزادی بخشی ہے، اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اُسے اپنی بے شمار مخلوقات پر تَصَرُّف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں، اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمّہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرزِ عمل پر اجر کا اور غلط طرزِ عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کیے ہیں بلکہ اللہ نے اسے دیے ہیں، اور ان کے صحیح و غلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جواب دِہ ہے، اس لیے قرآنِ مجید میں دوسرے مَقامات پر ان کو "خلافت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہاں انھی کے لیے "امانت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

یہ امانت کتنی اہم اور گراں بار ہے، اس کا تصور دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آسمان و زمین اپنی ساری عظمت کے باوجود اور پہاڑ اپنی زبردست جسامت و متانت کے باوجود اس کے اُٹھانے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے، مگر انسان ضعیف البُنیان نے اپنی ذرا سی جان پر یہ بھاری بوجھ اُٹھا لیا ہے۔

زمین و آسمان کے سامنے اس بارِ امانت کا پیش کیا جانا، اور ان کا اسے اُٹھانے سے انکار کرنا اور ڈر جانا ہوسکتا ہے کہ لُغوی معنیٰ میں ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بات استعارے کی زبان میں ارشاد ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات کے ساتھ جو تعلق ہے اسے ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ زمین اور سورج اور چاند اور پہاڑ جس طرح ہمارے لیے گونگے، بہرے اور بے جان ہیں، ضروری نہیں ہے کہ اللہ کے لیے بھی وہ ایسے ہی ہوں۔ اللہ اپنی ہر مخلوق سے بات کرسکتا ہے اور وہ اس کو جواب دے سکتی ہے۔ اس کی کیفیت کا سمجھنا ہمارے فہم و اِدراک سے بالاتر ہے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ فی الواقع اللہ نے ان کے سامنے یہ بارِ گراں پیش کیا ہو اور وہ اسے دیکھ کر کانپ اُٹھے ہوں اور انھوں نے اپنے مالک و خالق سے یہ عرض کیا ہو کہ ہم تو سرکار کے بے اختیار خادم ہی بن کر رہنے میں

QuranUrdu.com

اپنی خیر پاتے ہیں، ہماری یہ ہمت نہیں ہے کہ نافرمانی کی آزادی لے کر اُس کا حق ادا کر سکیں اور حق ادا نہ کرنے کی صورت میں حضور کی سزا برداشت کر سکیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے پوری نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور نوعیت کا وجود بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا ہو اور اس نے یہ اختیارات سنبھالنے پر خود آمادگی ظاہر کی ہو۔ اس بات کو ناممکن قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کو دائرۂ امکان سے خارج قرار دینے کا فیصلہ تو وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے ذہن و فکر کی استعداد کا غلط اندازہ لگا بیٹھا ہو۔

البتہ یہ امر بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات محض تمثیلی انداز میں فرمائی ہو اور صورتِ معاملہ کی غیر معمولی اہمیّت کا تصور دلانے کے لیے اِس طرح کا نقشہ پیش کیا گیا ہو کہ گویا ایک طرف زمین و آسمان اور ہمالہ جیسے پہاڑ کھڑے ہیں اور دوسری طرف ۵-۶ فٹ کا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ:

''میں اپنی ساری مخلوقات میں سے کسی ایک کو یہ طاقت بخشنا چاہتا ہوں کہ وہ میری خدائی میں رہتے ہوئے خود اپنی رضا و رغبت سے میری بالاتری کا اقرار اور میرے احکام کی اطاعت کرنا چاہے تو کرے، ورنہ وہ میرا انکار بھی کر سکے گا اور میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بھی لے کر اٹھ سکے گا۔ یہ آزادی دے کر میں اُس سے اِس طرح چُھپ جاؤں گا کہ گویا میں کہیں موجود نہیں ہوں۔ اور اس آزادی کو عمل میں لانے کے لیے میں اس کو وسیع اختیارات دوں گا، بڑی قابلیتیں عطا کروں گا، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو بالادستی بخش دوں گا، تاکہ وہ کائنات میں جو ہنگامہ بھی برپا کرنا چاہے کر سکے۔ اس کے بعد میں ایک وقتِ خاص پر اس کا حساب لوں گا۔ جس نے میری بخشی ہوئی آزادی کو غلط استعمال کیا ہوگا، اسے وہ سزا دوں گا جو میں نے کبھی اپنی کسی مخلوق کو نہیں دی ہے، اور جس نے نافرمانی کے سارے مواقع پا کر بھی میری فرماں برداری ہی اختیار کی ہوگی اسے وہ بلند مرتبے عطا کروں گا جو میری کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ اب بتاؤ، تم میں سے کون اس امتحان گاہ میں اترنے کو تیار ہے؟''

یہ تقریر سُن کر پہلے تو ساری کائنات میں سنّاٹا چھا جاتا ہے۔ پھر ایک سے ایک بڑھ کر گراں ڈیل مخلوق گھٹنے ٹیک کر التجا کرتی چلی جاتی ہے کہ اُسے اِس کڑے امتحان سے معاف رکھ جائے۔ آخر کار یہ مشتِ اُستخواں اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب! میں یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس امتحان کو پاس کر کے تیری سلطنت کا سب سے اُونچا عہدہ مل جانے کی جو اُمید ہے اُس کی بنا پر میں اُن سب خطرات کو انگیز کر جاؤں گا جو اس آزادی و خود مختاری میں پوشیدہ ہیں۔

یہ نقشہ اپنی چشمِ تصوّر کے سامنے لا کر ہی آدمی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں کس نازک مَقام پر کھڑا ہوا ہے۔ اب جو شخص اس امتحان گاہ میں بے فکرا بن کر رہتا ہے اور کوئی احساس نہیں رکھتا کہ وہ کتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، اور دنیا کی زندگی میں اپنے لیے کوئی رَوِیّہ انتخاب کرتے وقت جو فیصلے وہ کرتا ہے ان کے صحیح یا غلط ہونے سے کیا نتائج نکلنے والے ہیں، اسی کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں ظَلوم و جَہول قرار دے رہا ہے۔ وہ جَہول ہے، کیونکہ اس احمق نے اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ لیا ہے۔ اور وہ ظَلوم ہے، کیونکہ وہ خود اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے اور اپنے ساتھ نہ معلوم کتنے اور لوگوں کو لے ڈوبنا چاہتا ہے۔

QuranUrdu.com

ضمیمہ

بسلسلۂ حاشیہ نمبر ۷۷

ختمِ نُبوّت

ایک گروہ، جس نے اِس دَور میں نئی نبوت کا فتنۂ عظیم کھڑا کیا ہے، لفظ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کے معنیٰ ''نبیوں کی مہر'' کرتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو انبیاؑ بھی آئیں گے وہ آپؐ کی مُہر لگنے سے نبی بنیں گے، یا بالفاظِ دیگر، جب تک کسی کی نبوت پر آپؐ کی مہر نہ لگے وہ نبی نہ ہو سکے گا۔

لیکن جس سلسلۂ بیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو اِس لفظ کا یہ مفہُوم لینے کی قطعاً کوئی گنجایش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر یہی اس کے معنیٰ ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں، مقصودِ کلام کے بھی خلاف ہو جاتا ہے۔[1] آخر اس بات کا کیا تُک ہے کہ اُوپر سے تو نکاحِ زینبؓ پر معترضین کے اعتراضات اور ان کے پیدا کیے ہوئے شُکوک وشُبہات کا جواب دیا جا رہا ہو اور یکایک یہ بات کہہ ڈالی جائے کہ محمدؐ نبیوں کی مُہر ہیں، آیندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مُہر لگ کر بنے گا۔ اس سِیاق وسَباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ بالکل بے تُکی ہے، بلکہ اس سے وہ استدلال الٹا کمزور ہو جاتا ہے جو اُوپر سے معترضین کے جواب میں چلا آ رہا ہے۔ اس صورت میں تو معترضین کے لیے یہ کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپؐ یہ کام اِس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اِس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت ہے تو آپؐ کے بعد آپؐ کی مُہر لگ لگ کر جو انبیاؑ آتے رہیں گے، ان میں سے کوئی اسے مٹا دے گا۔

ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ ''خاتم النّبیّین'' کے معنی افضل النّبیّین کے ہیں، یعنی نبوت کا دروازہ تو کُھلا ہوا ہے، البتہ کمالاتِ نبوت حضورؐ پر ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مفہُوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اُوپر ہم نے بیان کی ہے۔ سیاق وسباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ الٹا اس کے خلاف پڑتا ہے۔ کفار و منافقین کہہ سکتے تھے کہ حضرت! کم تر درجے کے ہی سہی، بہر حال آپؐ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے۔ پھر کیا ضرور تھا کہ اس رسم کو بھی آپؐ ہی مٹا کر تشریف لے جاتے۔

لُغت کی رُو سے خاتَمَ النَّبِیّین کے معنیٰ

پس جہاں تک سیاق وسباق کا تعلق ہے، وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النّبیین کے معنیٰ سلسلۂ نبوت کو

[1] سلسلۂ بیان کو سمجھنے کے لیے اس سورہ کے حواشی نمبر ۶۷ تا ۷۹ نگاہ میں رہنے چاہییں۔

QuranUrdu.com

ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے، لغت بھی اِسی معنیٰ کی مقتضی ہے۔ عَرَبی لُغت اور محاورے کی رو سے ''ختم'' کے معنیٰ مُہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے، اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنیٰ ہیں فَرَغَ مِنَ الْعَمَلِ، ''کام سے فارغ ہو گیا۔''

خَتَمَ الْاِنَاءَ کے معنیٰ ہیں: ''برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مُہر لگا دی تا کہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو۔''

خَتَمَ الْکِتَابَ کے معنیٰ ہیں: ''خط بند کر کے اس پر مہر لگا دی تا کہ خط محفوظ ہو جائے۔''

خَتَمَ عَلَی الْقَلْبِ، ''دل پر مُہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے۔''

خِتَامُ کُلِّ مَشْرُوْبٍ، ''وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے۔''

خَاتِمَۃُ کُلِّ شَیْءٍ، عاقبتہ واٰخرتہ، ''ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت۔''

خَتَمَ الشَّیْءَ بلغ اٰخرہ، ''کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا۔'' اسی معنیٰ میں ختمِ قرآن بولتے ہیں اور اسی معنیٰ میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خَاتَمُ الْقَوْمِ اٰخرھم، ''خاتَم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی۔'' (مُلاحظہ ہو: لِسان العرب، قامُوس اور اقرب الموارد[1])

---

[1] یہاں ہم نے لُغت کی صرف تین کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن بات انھی تین کتابوں پر منحصر نہیں ہے۔ عربی زبان کی کوئی معتبر لُغت اُٹھا کر دیکھ لی جائے، اس میں لفظ خاتم کی یہی تشریح ملے گی۔ لیکن منکرینِ ختمِ نبوت خدا کے دین میں نقب لگانے کے لیے لُغت کو چھوڑ کر اس بات کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی شخص کو خاتم الشعرا، یا خاتم الفقہا یا خاتم المفسرین کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس شخص کو یہ لقب دیا گیا ہے اس کے بعد کوئی شاعر یا فقیہ یا مفسر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فن کے کمالات اُس شخص پر ختم ہو گئے۔ حالانکہ مبالغے کے طور پر اس طرح کے القاب کا استعمال یہ معنیٰ ہرگز نہیں رکھتا کہ لُغت کے اعتبار سے خاتم کے اصل معنیٰ ہی کامل یا افضل کے ہو جائیں اور ''آخری'' کے معنیٰ میں یہ لفظ استعمال کرنا سرے سے غلط قرار پائے۔ یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو زبان کے قواعد سے ناواقف ہو۔ کسی زبان میں بھی یہ قاعدہ نہیں ہے کہ اگر کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنیٰ کے بجائے کبھی کبھی مجازاً کسی دوسرے معنیٰ میں بولا جاتا ہو تو وہی معنیٰ اس کے اصل معنیٰ بن جائیں اور لُغت کی رُو سے جو اس کے حقیقی معنیٰ ہیں ان میں اس کا استعمال ممنوع ہو جائے۔ آپ کسی عرب کے سامنے جب کہیں گے کہ جَاءَ خاتَم القوم، تو وہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لے گا کہ قبیلے کا فاضل و کامل آدمی آ گیا، بلکہ اس کا مطلب وہ یہی لے گا کہ پورا کا پورا قبیلہ آ گیا ہے حتیٰ کہ آخری آدمی جو رہ گیا تھا وہ بھی آ گیا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ خاتَم الشعرا، خاتَم الفقہا اور خاتَم المحدثین وغیرہ القاب جو بعض لوگوں کو دیے گئے ہیں ان کے دینے والے انسان تھے اور انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ جس شخص کو وہ کسی صفت کے اعتبار سے خاتَم کہہ رہا ہے اس کے بعد پھر کوئی اس صفت کا حامل پیدا نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے انسانی کلام میں ان القاب کی حیثیت مبالغے اور اعترافِ کمال سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں

QuranUrdu.com

اسی بنا پر تمام اہلِ لُغت اور اہلِ تفسیر نے بالاتفاق خاتم النّبیین کے معنٰی آخر النّبیین کے لیے ہیں۔ عربی لُغت و محاورے کی رُو سے خاتم کے معنٰی ڈاک خانے کی مُہر کے نہیں ہیں جسے لگا لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مُہر ہے جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

ختمِ نُبوّت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

قرآن کے سیاق وسباق اور لُغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہوم ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کانت بنواسرائیل تسوسھم الانبیاء۔ کلما ھلک نبی خلفہ نبی، وانہ لانبی بعدی وسیکون خلفاء۔ (بخاری، کتاب المناقب، باب ماذکرعن بنی اسرائیل)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت انبیاؑ کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، بلکہ خلفا ہوں گے۔

(۲) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنٰی بیتًا فاحسنہ واجملہ الّا موضع لبنۃ من زاویۃٍ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون ھلّا وُضِعَتْ ھٰذہ اللبنۃ، فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین۔
(بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النّبیین)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاؑ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النّبیین ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی آئے۔)

اسی مضمون کی چار حدیثیں مسلم، کتاب الفضائل، باب خاتم النّبیین میں ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ زائد ہیں: فَجِئْتُ فختمت الانبیاء، ''پس میں آیا اور میں نے انبیاؑ کا سلسلہ ختم کر دیا۔''
یہی حدیث انھی الفاظ میں ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل النبی، اور کتاب الآداب، باب الامثال میں ہے۔

سکتی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے متعلق یہ کہہ دے کہ فلاں صفت اُس پر ختم ہوگئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے بھی انسانی کلام کی طرح مجازی کلام سمجھ لیں۔ اللہ نے اگر کسی کو خاتم الشعرا کہہ دیا ہوتا تو یقیناً اس کے بعد کوئی شاعر نہیں ہوسکتا تھا۔ اور اس نے جسے خاتم النّبیین کہہ دیا، غیر ممکن ہے کہ اس کے بعد کوئی نبی ہو سکے۔ اس لیے کہ اللہ عالم الغیب ہے اور انسان عالم الغیب نہیں ہیں۔ اللہ کا کسی کو خاتم النّبیین کہنا اور انسانوں کا کسی کو خاتم الشعرا اور خاتم الفقہا وغیرہ کہہ دینا آخر ایک درجے میں کیسے ہوسکتا ہے۔

QuranUrdu.com

مُسنَدِ ابوداؤد طَیالِسی میں یہ حدیث جابرؓ بن عبداللہ کی رِوایت کردہ احادیث کے سلسلے میں آئی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: ختم بی الانبیاء، ''میرے ذریعے سے انبیاؑ کا سلسلہ ختم کیا گیا۔''

مُسنَدِ احمد میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ اس مضمون کی احادیث حضرت اُبَیؓ بن کعبؓ، حضرت ابوسعید خُدرِیؓ اور حضرت ابوہُرَیرہؓ سے نقل کی گئی ہیں۔

(۳) ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال فُضِّلْتُ علی الانبیآء بستٍّ ، اعطیت جوامع الکلم ، ونصرت بالرعب ، واُحلّت لی الغنائم ، وجعلت لی الارض مسجدًا وطهورًا ، واُرسلتُ الی الخلق کافة ، وختم بی النبیّون۔ (مسلم۔ تِرمِذی۔ ابنِ ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے چھ باتوں میں انبیاؑ پر فضیلت دی گئی ہے: (۱) مجھے جامع ومختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی (۲) مجھے رعب کے ذریعے سے نُصرت بخشی گئی (۳) میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کیے گئے۔ (۴) میرے لیے زمین کو مسجد بھی بنا دیا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔ (یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں میں ہی نہیں بلکہ رُوئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جاسکتی ہے، اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمّم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جاسکتی ہے اور غسل کی حاجت بھی۔) (۵) مجھے تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا۔ (۶) اور میرے اُوپر انبیاؑ کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

(۴) قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی (ترمِذی، کتاب الرُّؤیا، باب ذہاب النبوۃ۔ مُسندِ احمد، مَرویّاتِ اَنسؓ بن مالک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

(۵) قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم انا محمد وانا احمد ، وانا الماحی الذی یُمحٰی بی الکفر، وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی عقبی، وانا العاقب الذی لیس بعدهٗ نبی۔ (بخاری ومسلم، کتاب الفضائل، باب اسماء النبی۔ تِرمِذی، کتاب الآداب، باب اسماء النبی۔ مُؤطّا، کتاب اسماء النبی۔ المستدرک للحاکم، کتاب التاریخ، باب اسماء النبی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد ہوں۔ میں احمد ہوں۔ میں ماحی ہوں، کہ میرے ذریعے سے کفر محو کیا جائے گا۔ میں حاشر ہوں، کہ میرے بعد لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے۔ (یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی آنی ہے۔) اور میں عاقب ہوں، اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

(۶) قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان اللّٰه لم یبعث نبیًّا الاحذر امته الدّجّال وانا اٰخر الانبیاء وانتم اٰخر الامم وهو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجّال کے خُروج سے نہ ڈرایا ہو (مگر ان کے زمانے میں وہ نہ

QuranUrdu.com

خارج فیکم لامحالۃ

(ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب الدّجّال)

آیا)۔ اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔ لامحالہ اب اس کو تمھارے اندر ہی نکلنا ہے۔

(۷) عن عبدالرحمٰن بن جبیر قال سمعت عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص یقول خرج علینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یومًا کالمودّع فقال انا محمّد النبی الامی ثلاثًا ولانبی بعدی۔ (مُسْنَدِ احمد، مَرْوِیّاتِ عبداللہ بن عَمْرؓو بن العاص)

عبدالرحمٰن بن جُبَیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہؓ بن عَمْرؓو بن عاصؓ کو یہ کہتے سنا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر ہمارے درمیان تشریف لائے، اس انداز سے کہ گویا آپؐ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: ''میں محمد نبیِ اُمّی ہوں۔'' پھر فرمایا: ''اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

(۸) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا نبوۃ بعدی الا المبشرات۔ قیل وما المبشرات یا رسول اللّٰہ؟ قال الرؤیا الحسنۃ ۔ او قال الرؤیا الصالحۃ۔

(مُسْنَدِ احمد، مَرْوِیّاتِ ابو الطفیلؓ۔ نَسائی۔ ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد کوئی نُبُوّت نہیں ہے، صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں۔'' عرض کیا گیا: ''وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں یا رسول اللہ؟'' فرمایا: ''اچھا خواب''، یا فرمایا ''صالح خواب۔'' (یعنی وحی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اشارہ ملے گا بھی تو بس اچھے خواب کے ذریعے سے مل جائے گا۔)

(۹) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لو کان بعدی نبیّ لکان عمر بن الخطاب۔

(تِرْمِذِی، کتاب المناقب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ بن الخطّاب ہوتے۔

(۱۰) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لِعَلِیٍّ انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسٰی، الا انہ لانبی بعدی۔

(بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہؓ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: میرے ساتھ تمھاری نسبت وہی ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

بخاری و مسلم نے یہ حدیث غزوۂ تبوک کے ذکر میں بھی نقل کی ہے۔ مُسْنَدِ احمد میں اس مضمون کی دو حدیثیں حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص سے رِوایَت کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا آخری فقرہ یوں ہے: الا انہ لا نبوۃ بعدی، ''مگر میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔'' ابوداؤد طَیالسیؒ، امام احمدؒ اور محمد بن اسحاقؒ نے اس سلسلے میں جو تفصیلی روایات نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جاتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مدینۂ طیّبہ کی حفاظت و نگرانی کے لیے اپنے پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ منافقین نے اس پر طرح طرح کی باتیں ان کے بارے میں کہنی شروع کر دیں۔ انھوں نے جا کر حضورؐ سے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟'' اس موقع پر حضورؐ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ''تم میرے ساتھ وہی نسبت

QuranUrdu.com

رکھتے ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ رکھتے تھے۔'' یعنی جس طرح حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا تھا اسی طرح میں تم کو مدینے کی حفاظت کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ حضرت ہارونؑ کے ساتھ یہ تشبیہ کہیں بعد میں کسی فتنے کی موجب نہ بن جائے، اس لیے فوراً آپؐ نے یہ تصریح فرما دی کہ میرے بعد کوئی شخص نبی ہونے والا نہیں ہے۔

(۱۱) عن ثوبان قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ...... وانہ سیکون فی اُمّتی کذّابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔ (ابوداؤد، کتاب الفتن)

ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ...... اور یہ کہ میری اُمت میں تیس کذّاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا، حالانکہ میں خاتم النّبیّین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ابوداؤد نے کتاب المَلاحم میں حضرت ابوہُریرہؓ سے روایت کی ہے۔ ترمذی نے بھی حضرت ثَوبانؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ دونوں رِوایتیں نقل کی ہیں، اور دوسری رِوایت کے الفاظ یہ ہیں: حتی یبعث دجالون کذابون قریب من ثلاثین کلھم یزعم انہ رسول اللّٰہ، ''یہاں تک کہ اٹھیں گے تیس کے قریب جھوٹے فریبی، جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔''

(۱۲) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یُکلّمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن من امتی احد فعمر۔ (بخاری، کتاب المناقب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے جو بنی اسرائیل گزرے ہیں، ان میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جن سے کلام کیا جاتا تھا، بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں۔ میری امت میں اگر کوئی ہوا تو وہ عمرؓ ہوگا۔

مسلم میں اس مضمون کی جو حدیث ہے اس میں یکلّمون کے بجائے محدَّثون کا لفظ ہے۔ لیکن مُکلَّم اور محدَّث، دونوں کے معنیٰ ایک ہی ہیں، یعنی ایسا شخص جو مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہو، یا جس کے ساتھ پردۂ غیب سے بات کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے بغیر مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہونے والے بھی اس امت میں اگر کوئی ہوتے تو وہ حضرت عمرؓ ہوتے۔

(۱۳) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لانبی بعدی ولا امۃ بعد امتی۔ (بَیْہَقی، کتاب الرُّؤیا، طَبَرانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت (یعنی کسی نئے آنے والے نبی کی امت) نہیں۔

(۱۴) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم فانی اٰخر الانبیاء وان مسجدی اٰخر المساجد۔ (مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلوٰۃ بمسجد مکہ والمدینہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَیں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (یعنی مسجد نبوی) ہے۔[1]

---

[1] منکرین ختمِ نبوت اس حدیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جس طرح حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخر المساجد فرمایا، حالانکہ وہ آخری

QuranUrdu.com

یہ احادیث بکثرت صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بکثرت محدّثین نے ان کو بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر، مختلف طریقوں سے، مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپؐ آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے، اور آپؐ کے بعد جو لوگ بھی رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ دجال و کذاب[1] ہیں۔ قرآن کے الفاظ ''خاتم النّبیین'' کی اس سے زیادہ مستند و معتبر اور قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہوسکتی ہے۔ رسولِ پاکؐ کا ارشاد تو بجائے خود سند و حُجّت ہے۔ مگر جب وہ قرآن کی ایک نَصّ کی شرح کر رہا ہو تب تو وہ اور بھی زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اَور کون ہوسکتا ہے کہ وہ ختمِ نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم اُسے قبول کرنا کیا معنیٰ قابلِ التفات بھی نہ سمجھیں؟

مسجد نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی بے شمار مسجدیں دنیا میں بنی ہیں، اسی طرح جب آپؐ نے فرمایا کہ میں آخر الانبیاء ہوں تو اس کے معنیٰ بھی یہی ہیں کہ آپؐ کے بعد نبی آتے رہیں گے، البتہ فضیلت کے اعتبار سے آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کی مسجد آخری مسجد ہے۔ لیکن درحقیقت اسی طرح کی تاویلیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کے کلام کو سمجھنے کی اہلیّت سے محروم ہو چکے ہیں۔ صحیح مسلم کے جس مقام پر یہ حدیث وارد ہوئی ہے اس کے سلسلے کی تمام احادیث کو ایک نظر ہی آدمی دیکھ لے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخری مسجد کس معنیٰ میں فرمایا ہے۔ اس مقام پر حضرت ابوہُریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور ام المومنین حضرت میمونہؓ کے حوالے سے جو روایات امام مسلمؒ نے نقل کی ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں صرف تین مساجد ایسی ہیں جن کو عام مساجد پر فضیلت حاصل ہے، جن میں نماز پڑھنا دوسری مساجد میں نماز پڑھنے سے ہزار گُنا زیادہ ثواب رکھتا ہے، اور اسی بنا پر صرف انھی تین مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کر کے جانا جائز ہے، باقی کسی مسجد کا یہ حق نہیں ہے کہ آدمی دوسری مسجدوں کو چھوڑ کر خاص طور پر اُس میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کرے۔ ان میں سے پہلی مسجد، مسجد الحرام ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ دوسری مسجد، مسجدِ اقصیٰ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ اور تیسری مسجد، مدینۂ طیّبہ کی مسجدِ نبویؐ ہے جس کی بِنا حضور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ حضورؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اب چونکہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اس لیے میری اس مسجد کے بعد دنیا میں کوئی چوتھی مسجد ایسی بننے والی نہیں ہے جس میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں سے زیادہ ہو اور جس کی طرف نماز کی غرض سے سفر کر کے جانا درست ہو۔

[1] منکرینِ ختمِ نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلے میں اگر کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو وہ یہ روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: قولوا انه خاتم الانبیاء ولا تقولوا لانبی بعدہٗ ''یہ تو کہو کہ حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں، مگر یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔'' لیکن اوّل تو حضورؐ کے صاف صاف ارشادات کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کے کسی قول کو پیش کرنا ہی سخت گستاخی و بے ادبی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عائشہؓ کی طرف جس رِوایت میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے وہ بجائے خود غیر مستند ہے۔ اسے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں کسی قابلِ ذکر محدّث نے نقل نہیں کیا ہے۔ تفسیر کی ایک کتاب دُرِّ منثُور اور لُغتِ حدیث کی ایک کتاب تکملۂ مجمع البحار سے اس کو نقل کیا جاتا ہے مگر اس کی سند کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ ایسی ایک ضعیف ترین رِوایت اور وہ بھی ایک صحابیہ کے قول کو لا کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن ارشادات کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے جنھیں تمام اکابر محدثین نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

QuranUrdu.com

صحابۂ کرامؓ کا اِجماع

قرآن وسنّت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابۂ کرامؓ کے اِجماع کی ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی رِوایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، اُن سب کے خلاف صحابۂ کرامؓ نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

اِس سلسلے میں خُصوصیّت کے ساتھ مُسَیْلَمۂ کذّاب کا معاملہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اُسے حضورؐ کے ساتھ شریکِ نبوت بنایا گیا ہے۔ اُس نے حضورؐ کی وفات سے پہلے جو عریضہ آپؐ کو لکھا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

من مُسَیْلمة رسول اللّٰہ الٰی محمدٍ رسول اللّٰہ سلام علیك فانی اُشْرِکتُ فی الامر معك ۔ (طَبَری، جلد دوم، ص ۳۹۹، طبع مصر)	مُسَیلِمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف! آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ میں آپ کے ساتھ نبوت کے کام میں شریک کیا گیا ہوں۔

علاوہ بریں مؤرّخ طَبَریؒ نے یہ روایت بیان کی ہے کہ مُسَیلِمہ کے ہاں جو اذان دی جاتی تھی، اس میں اشھد انّ محمدًا رسول اللّٰہ کے الفاظ بھی کہے جاتے تھے۔ اس صریح اقرارِ رسالتِ محمدؐی کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملت قرار دیا گیا اور اس سے جنگ کی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بنوحَنِیفہ نیک نیتی کے ساتھ (in good faith) اُس پر ایمان لائے تھے اور انھیں واقعی اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود شریکِ رسالت کیا ہے۔ نیز قرآن کی آیات کو اُن کے سامنے مُسَیلِمہ پر نازل شدہ آیات کی حیثیت سے ایک ایسے شخص نے پیش کیا تھا جو مدینۂ طَیِّبہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کر کے گیا تھا۔ (البِدَایہ و النّھایہ لابنِ کثیر، جلد ۵، ص ۵۱) مگر اس کے باوجود صحابۂ کرامؓ نے ان کو مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ پھر یہ کہنے کی بھی گنجایش نہیں کہ صحابہؓ نے ان کے خلاف اِرتِداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کے جرم میں جنگ کی تھی۔ اسلامی قانون کی رُو سے باغی مسلمانوں کے خلاف اگر جنگ کی نوبت آئے تو ان کے اسیرانِ جنگ غلام نہیں بنائے جاسکتے۔ بلکہ مسلمان تو درکنار، ذِمّی بھی اگر باغی ہوں تو گرفتار ہونے کے بعد ان کو غلام بنانا جائز نہیں ہے۔ لیکن مُسَیلِمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے اعلان فرمایا کہ اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جائے گا۔ اور جب وہ لوگ اَسیر ہوئے تو فی الواقع ان کو غلام بنایا گیا۔ چنانچہ انھی میں سے ایک لونڈی حضرت علیؓ کے حصّے میں آئی جس کے بطن سے تاریخِ اسلام کی مشہور شخصیت محمد بن حَنَفِیَہ[1] نے جنم لیا۔ (البِدَایہ والنّھایہ، جلد ۶، ص ۳۱۶، ۳۲۵) اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہؓ نے جس جُرم کی بنا پر ان سے جنگ کی تھی وہ بغاوت کا جرم نہ تھا بلکہ یہ جرم تھا کہ ایک شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا اور دوسرے لوگ اس کی نبوت پر ایمان لائے۔ یہ کارروائی حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد ہوئی ہے، حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں ہوئی ہے، اور صحابہؓ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی ہے۔ اِجماعِ صحابہؓ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

---

[1] حَنَفِیَہ سے مراد ہے قبیلۂ بنوحَنِیفہ کی عورت۔

QuranUrdu.com

تمام علمائے اُمّت کا اِجماع

اجماعِ صحابہ کے بعد چوتھے نمبر پر مسائلِ دین میں جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے وہ دَورِ صحابہؓ کے بعد کے علمائے اُمت کا اجماع ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علما اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ جو بھی آپؐ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اس کو مانے، وہ کافر خارج از ملّتِ اسلام ہے۔ اس سلسلے کے بھی چند شواہد مُلاحظہ ہوں:

(۱) امام ابوحنیفہؒ (۸۰ھ-۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا: "مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں۔" اس پر امامِ اعظمؒ نے فرمایا کہ "جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے گا، وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ لا نبی بعدی"۔ (مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ لابنِ احمد المکّی، ج ۱ ص ۱۶۱ - مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

(۲) علامہ ابنِ جَرِیر طَبَرِیؒ (۲۲۴ھ-۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کا مطلب بیان کرتے ہیں: الذی ختم النبوۃ فطبع علیھا فلا تفتح لاحد بعدہٗ الی قیام الساعۃ "جس نے نبوت کو ختم کر دیا اور اس پر مُہر لگا دی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا۔" (تفسیر ابنِ جَرِیر، جلد ۲۲، صفحہ ۱۲)

(۳) امام طَحَاوِیؒ (۲۳۹ھ-۳۲۱ھ) اپنی کتاب "عقیدۂ سَلَفِیہ" میں سَلَف صالحین، اور خُصوصاً امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسُف اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: "اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برگزیدہ بندے، چیدہ نبی اور پسندیدہ رسول ہیں اور وہ خاتم الانبیا، امام الاتقیا، سَیِّد المرسلین اور حبیبِ ربّ العالَمین ہیں، اور ان کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہشِ نفس کی بندگی ہے۔" (شرح الطّحاویہ فی العقیدۃ السَّلَفِیّہ، دار المعارف مصر، صفحات ۱۵، ۸۷، ۹۶، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۲)

(۴) علّامہ ابنِ حَزْم اَنْدَلُسیؒ (۳۸۴ھ-۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: "یقیناً وحی کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزّوجلّ فرما چکا ہے کہ محمدؐ نہیں ہیں تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ، وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔" (المُحلّٰی، ج ۱ ص ۲۶)

(۵) امام غَزّالیؒ (۴۵۰ھ-۵۰۵ھ) فرماتے ہیں[1]:

لو فتح ھٰذا الباب (ای باب انکار کون الاجماع حجۃ) انجر الی امور شنیعۃ وھو	اگر یہ دروازہ (یعنی اجماع کو حجت ماننے سے انکار کا دروازہ) کھول دیا جائے تو بڑی قبیح باتوں تک

[1] امام غَزّالیؒ کی اس رائے کو ہم ان کی اصل عبادت کے ساتھ اس لیے نقل کر رہے ہیں کہ منکرینِ ختمِ نبوت نے اس حوالے کی صحت کو بڑے زور شور سے چیلنج کیا ہے۔

QuranUrdu.com

قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؗ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝۴ بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ

رسولؐ نے کہا: میرا رب ہر اُس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے، وہ سمیع اور علیم ہے[۶]۔

وہ کہتے ہیں: ''بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اِس کی مَن گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے[۷]۔

۶ – یعنی رسول نے کبھی اس جھوٹے پروپیگنڈے اور سرگوشیوں کی اس مہم (whispering campaign) کا جواب اس کے سوا نہ دیا کہ ''تم لوگ جو کچھ باتیں بناتے ہو، سب خدا سنتا اور جانتا ہے، خواہ زور سے کہو، خواہ چپکے چپکے کانوں میں پھونکو۔'' وہ کبھی بے انصاف دشمنوں کے مقابلے میں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر نہ اُتر آیا۔

۷ – اس کا پَس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکے کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپؐ کے مقابلے میں پروپیگنڈے کی ایک مہم شروع کی جائے، اور ہر اس شخص کو، جو مکے میں زیارت کے لیے آئے، آپؐ کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپؐ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ مہینے جاری رہتی تھی، مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیے جاتے تھے، جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایک آدمی ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادُوگر ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے، اور کہتا ہے خدا کا کلام ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ اجی! وہ کلام کیا ہے، دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پلندا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ تخیلات اور تُک بندیاں ہیں، جن کا نام اس نے کلامِ الٰہی رکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے۔ صداقت کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا کہ جم کر کوئی ایک قطعی اور جچی تُلی رائے ظاہر کرتے۔ لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا، وہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انھوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ آپؐ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہوسکتی تھی، وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدّت ہی کے اندر ہوگئی۔ ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہوگیا کہ آخر معلوم تو ہو، وہ کون ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہے، اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے۔ ہم کوئی بچے تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دلچسپ مثال طُفیل بن عَمْرو دَوسی کا قصّہ ہے، جسے ابنِ اسحاق نے خود ان کی رِوایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلۂ دَوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبیؐ کے خلاف خوب میرے کان بھرے، یہاں تک کہ میں آپؐ سے سخت بدگمان ہوگیا اور میں نے طے کرلیا کہ

QuranUrdu.com

پس آپؐ انبیاءؑ کے خاتم ہیں...... اور ابنِ عباسؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اِس آیت میں) یہ فیصلہ فرمادیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔'' (جلد ۳، ص ۱۵۸)

(۷) علّامہ زَمَخشَری (۴۶۷ھ-۵۳۸ھ) تفسیر کَشّاف میں لکھتے ہیں: ''اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کیسے ہوئے جب کہ حضرت عیسٰیؑ آخر زمانے میں نازل ہوں گے؟ تو میں کہوں گا کہ آپؐ کا آخری نبی ہونا اس معنٰی میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا، اور عیسٰی علیہ السلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جاچکے تھے، اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدیہ کے پیرو اور آپؐ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے، گویا کہ وہ آپؐ ہی کی اُمت کے ایک فرد ہیں۔'' (جلد ۲، ص ۲۱۵)

(۸) قاضی عِیَاضؒ (مُتوَفّٰی ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں: ''جو شخص خود اپنے حق میں نبوت کا دعوٰی کرے، یا اس بات کو جائز رکھے کہ آدمی نبوت کا اکتساب کرسکتا ہے اور صفائیِ قلب کے ذریعے سے مرتبۂ نبوت کو پہنچ سکتا ہے، جیسا کہ بعض فلسفی اور غالی صوفی کہتے ہیں، اور اسی طرح جو شخص نبوت کا دعوٰی تو نہ کرے مگر یہ دعوٰی کرے کہ اس پر وحی آتی ہے...... ایسے سب لوگ کافر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے والے ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے خبر دی ہے کہ آپؐ خاتم النّبیین ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر پہنچائی ہے کہ آپؐ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی طرف آپؐ کو بھیجا گیا ہے۔ اور تمام اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر مفہُوم پر محمول ہے، اس کے معنٰی ومفہُوم میں کسی تاویل وتخصیص کی گنجایش نہیں ہے۔ لہٰذا اِن تمام گروہوں کے کافر ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں، بربِنائے اجماع بھی اور بربِنائے نقل بھی۔'' (شفا، جلد ۲، ص ۲۷۰-۲۷۱)

(۹) علامہ شُہرستانیؒ (مُتوَفّٰی ۵۴۸ھ) اپنی مشہور کتاب اَلمِلَل والنِّحَل میں لکھتے ہیں: ''اور اسی طرح جو کہے...... کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے (بجز عیسٰی علیہ السلام کے) تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے۔'' (جلد ۳، ص ۲۴۹)

(۱۰) امام رازیؒ (۵۴۳ھ-۶۰۶ھ) اپنی تفسیرِ کبیر میں آیتِ خاتم النّبیین کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
''اس سلسلہ بیان میں وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو وہ اگر نصیحت اور توضیحِ احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اُسے پورا کرسکتا ہے۔ مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو وہ اپنی اُمت پر زیادہ شفیق ہوتا ہے اور اس کو زیادہ واضح رہنمائی دیتا ہے کیونکہ اس کی مثال اُس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی وسرپرست اُس کے بعد نہیں ہے۔'' (جلد ۶، ص ۵۸۱)

(۱۱) علامہ بَیضاویؒ (مُتوَفّٰی ۶۵۸ھ) اپنی تفسیر انوار التّنزیل میں لکھتے ہیں: ''یعنی آپؐ انبیاءؑ میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے ان کا سلسلہ ختم کردیا، یا جس سے انبیاءؑ کے سلسلے پر مُہر کردی گئی۔ اور عیسٰی علیہ السلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا اس ختمِ نبوت میں قادح نہیں ہے کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپؐ ہی کے دین پر ہوں گے۔'' (جلد ۴، ص ۱۶۴)

(۱۲) علامہ حافظ الدین النّسَفیؒ (مُتوَفّٰی ۷۱۰ھ) اپنی تفسیر ''مَدارِک التّنزیل'' میں لکھتے ہیں: ''اور آپؐ خاتم النّبیّین ہیں......

QuranUrdu.com

یعنی نبیوں میں سب سے آخری۔ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا۔ رہے عیسیٰؑ، تو وہ ان انبیاؑ میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے، گویا کہ وہ آپؐ کی اُمت کے افراد میں سے ہیں۔'' (ص ۴۷۱)

(۱۳) علامہ علاء الدین بغدادی (مُتوفّٰی ۷۲۵ھ) اپنی تفسیر ''خازِن'' میں لکھتے ہیں: وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ، یعنی اللہ نے آپؐ پر نبوت ختم کر دی، اب نہ آپؐ کے بعد کوئی نبوت ہے نہ آپؐ کے ساتھ کوئی اس میں شریک...... وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا، یعنی یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔'' (ص ۴۷۱-۴۷۲)

(۱۴) علّامہ ابنِ کثیرؒ (مُتوفّٰی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں: ''پس یہ آیت اس باب میں نَصِّ صریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جب آپؐ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول بدرجۂ اَولیٰ نہیں ہے، کیوں کہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوت کا منصب عام، ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا...... حضورؐ کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجّال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے، خواہ وہ کیسے ہی خَرقِ عادت اور شُعبدے اور جادو اور طِلِسم اور کرشمے بنا کر لے آئے ...... یہی حیثیت ہر اُس شخص کی ہے جو قیامت تک اس منصب کا مدّعی ہو۔'' (جلد ۳، ص ۴۹۳-۴۹۴)

(۱۵) علامہ جلال الدین سُیوطیؒ (مُتوفّٰی ۹۱۱ھ) تفسیر جلالَین میں لکھتے ہیں: ''وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا، یعنی اللہ اس بات کو جانتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور عیسیٰؑ جب نازل ہوں گے تو آپؐ کی شریعت ہی کے مطابق عمل کریں گے۔'' (ص ۷۶۸)

(۱۶) علامہ ابنِ نُجَیمؒ (مُتوفّٰی ۹۷۰ھ) اُصُولِ فقہ کی مشہور کتاب اَلْاَشْبَاہ وَالنَّظَائِر، کتاب السِّیَر، باب الرِّدَّہ میں لکھتے ہیں: ''اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ اُن باتوں میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔'' (ص ۱۷۹)

(۱۷) مُلّا علی قاریؒ (مُتوفّٰی ۱۰۱۶ھ) شرحِ فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔'' (ص ۲۰۲)

(۱۸) شیخ اسماعیل حَقّیؒ (مُتوفّٰی ۱۱۳۷ھ) تفسیر رُوح البَیان میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عاصم نے لفظ خاتَم ''ت'' کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنیٰ ہیں آلۂ ختم کے جس سے مُہر کی جاتی ہے۔ جیسے طابع اس چیز کو کہتے ہیں جس سے ٹھپّا لگایا جائے۔ مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انبیاؑ میں سب سے آخر تھے جن کے ذریعے سے نبیوں کے سلسلے پر مُہر لگا دی گئی۔ فارسی میں اسے ''مُہرِ پیغمبراں'' کہیں گے یعنی آپؐ سے نبوت کا دروازہ سربمہر کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی قاریوں نے اسے ''ت'' کے زیر کے ساتھ خاتِم پڑھا ہے، یعنی آپؐ مُہر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اس کو ''مُہر کُنندۂ پیغمبراں'' کہیں گے۔ اس طرح یہ لفظ بھی خاتَم کا ہم معنیٰ ہی ہے ...... اب آپؐ کی امت کے علما آپؐ سے صرف وِلایت ہی کی میراث پائیں گے، نبوت کی میراث آپؐ کی ختمیّت کے باعث ختم ہو چکی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپؐ کے

QuranUrdu.com

بعد نازل ہونا آپؐ کے خاتم النّبیّین ہونے میں قادح نہیں ہے، کیونکہ خاتم النّبیّین ہونے کے معنٰی یہ ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جائے گا......اور عیسیٰؑ آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے پیروکی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ آپؐ ہی کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے۔ آپؐ کی اُمت کے ایک فرد کی طرح ہوں گے۔ نہ اُن کی طرف وحی آئے گی اور نہ وہ نئے احکام دیں گے۔ بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہوں گے......اور اہلِ سُنّت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا: لا نبی بعدی۔ اب جو کوئی کہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے نَصّ کا انکار کیا۔ اور اسی طرح اُس شخص کی بھی تکفیر کی جائے گی جو اس میں شک کرے، کیونکہ حجت نے حق کو باطل سے مُمیّز کر دیا ہے۔ اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے، اس کا دعویٰ باطل کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔" (جلد ۲۲،ص ۱۸۸)

(۱۹) فتاویٰ عالمگیری، جسے بارھویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علما نے مُرتّب کیا تھا، اس میں لکھا ہے: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔" (جلد ۲،ص ۲۶۳)

(۲۰) علامہ شَوکانی (مُتوفّٰی ۱۲۵۵ھ) اپنی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں: "جمہور نے لفظِ خاتِم کو "ت" کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم نے زبر کے ساتھ۔ پہلی قراءت کے معنٰی یہ ہیں کہ آپؐ نے انبیا کو ختم کیا، یعنی سب کے آخر میں آئے۔ اور دوسری قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ ان کے لیے مہر کی طرح ہو گئے جس کے ذریعے سے ان کا سلسلہ سربمُہر ہو گیا اور جس کے شمول سے ان کا گروہ مزیّن ہوا۔" (جلد ۴،ص ۲۷۵)

(۲۱) علامہ آلُوسی (متوفّٰی ۱۲۷۰ھ) تفسیر رُوح المعانی میں لکھتے ہیں: "نبی کا لفظ رسول کی بہ نسبت عام ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النّبیّین ہونے سے خود بخود لازم آتا ہے کہ آپؐ خاتم المرسلین بھی ہوں۔ اور آپؐ کے خاتمِ انبیا و رُسل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں وصفِ نبوت سے آپؐ کے متصف ہونے کے بعد اب جنّ وانس میں سے ہر ایک کے لیے نبوت کا وصف منقطع ہو گیا۔" (جلد ۲۲،ص ۳۲) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص وحیِ نبوت کا مدّعی ہو، اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔" (جلد ۲۲،ص ۳۸) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النّبیّین ہونا ایک ایسی بات ہے جسے کتاب اللہ نے صاف صاف بیان کیا، سنت نے واضح طور پر اس کی تصریح کی، اور اُمت نے اس پر اجماع کیا۔ لہٰذا جو اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرے اسے کافر قرار دیا جائے گا۔" (جلد ۲۲،ص ۳۹)

یہ ہندوستان سے لے کر مراکش اور اَندلُس تک، اور ترُکی سے لے کر یمن تک ہر مسلمان ملک کے اکابر علما و فقہا اور محدثین و مفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہم نے ان کے ناموں کے ساتھ ان کے سِنینِ ولادت ووفات بھی دے دیے ہیں، جن سے

QuranUrdu.com

ہر شخص بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک تاریخ اسلام کی ہر صدی کے اکابر اُن میں شامل ہیں۔ اگرچہ ہم چودھویں صدی کے علمائے اسلام کی تصریحات بھی نقل کر سکتے تھے، مگر ہم نے قصداً انھیں اس لیے چھوڑ دیا کہ اُن کی تفسیر کے جواب میں ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اِس دَور کے مدعیِ نبوت کی ضد میں ختمِ نبوت کے یہ معنیٰ بیان کیے ہیں۔ اس لیے ہم نے پہلے علما کی تحریریں نقل کی ہیں جو ظاہر ہے کہ آج کے کسی شخص سے کوئی ضد نہ رکھ سکتے تھے۔ اِن تحریروں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی سے آج تک پوری دنیائے اسلام مُتّفَقہ طور پر ''خاتم النّبیّین'' کے معنیٰ ''آخری نبی'' ہی سمجھتی رہی ہے، حضورؐ کے بعد نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا مُتّفَق عَلَیہ عقیدہ رہا ہے، اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اُس کے دعوے کو مانے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اب یہ دیکھنا ہر صاحبِ عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خاتم النّبیّین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے، جو قرآن کی عبارت کے سِیاق وسَباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دی ہے، جس پر صحابۂ کرامؓ کا اِجماع ہے، اور جسے صحابۂ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف مانتے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے مدّعی کے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجایش باقی رہ جاتی ہے، اور ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان تسلیم کیا جا سکتا ہے جنھوں نے بابِ نبوت کے مفتوح ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب حریم نبوت میں داخل بھی ہو گئے ہیں اور یہ لوگ ان کی نبوت پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں تین باتیں اور قابلِ غور ہیں:

کیا اللہ کو ہمارے ایمان سے کوئی دشمنی ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے یہ اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اُس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے ایک نازک معاملے میں تو اللہ تعالیٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدرجۂ اَولیٰ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف اس کی تصریح فرماتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اس کا کُھلا کُھلا اعلان کراتا اور حضورؐ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی امت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاؑ آئیں گے اور تمھیں ان کو ماننا ہوگا۔ آخر اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہمارے دین و ایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضورؐ کے بعد نبوت کا دروازہ تو کُھلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی ہوتا جس پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہ ہو سکتے، مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسولؐ، دونوں ایسی باتیں فرما دیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری امت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

اب اگر بفرضِ محال نبوت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آ بھی جائے تو ہم بے خوف و خطر اس کا انکار کر دیں گے۔

QuranUrdu.com

خطرہ ہوسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باز پُرس ہی کا تو ہوسکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسرِ عدالت لا کر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ! اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا۔ لیکن اگر نبوت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی مدّعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کون سا ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش کر سکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے، اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے کیا ایک عقل مند آدمی اس پر اعتماد کر کے کفر کی سزا کا خطرہ مول لے سکتا ہے؟

اب نبی کی آخر ضرورت کیا ہے؟

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اُس شخص میں پیدا ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عملِ صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے، اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیا پر انبیا نہیں بھیجے جاتے۔

قرآنِ مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرّر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آئی ہے تو پتا چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاؑ مبعوث ہوئے ہیں:

اوّل یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اِس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بُھلا دی گئی ہو، یا اس میں تحریف ہو گئی ہو، اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعے سے مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیلِ دین کے لیے مزید انبیا کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔

قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدّنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپؐ کی بِعثَت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپؐ کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیا آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

QuranUrdu.com

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث وسیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپؐ لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپؐ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اِس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپؐ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری صورت بھی ختم ہو گئی۔

پھر قرآنِ مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضورؐ کے ذریعے سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لہٰذا تکمیلِ دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضورؐ کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کون سی ہے جس کے لیے آپؐ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اُس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جائے، اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنّت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیا کی۔

نئی نبوت اب اُمّت کے لیے رحمت نہیں بلکہ لعنت ہے

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آئے گا فوراً اس میں کفر وایمان کا سوال اُٹھ کھڑا ہو گا۔ جو اس کو مانیں گے وہ ایک اُمت قرار پائیں گے اور جو اس کو نہ مانیں گے وہ لامحالہ دوسری اُمت ہوں گے۔ اِن دونوں امتوں کا اختلاف محض فُرُوعی اختلاف نہ ہو گا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا ایسا بنیادی اختلاف ہو گا جو اُنھیں اُس وقت تک جمع نہ ہونے دے گا جب تک ان میں سے کوئی اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے، کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذِ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہو گا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو گا۔

ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اُس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختمِ نبوت اُمتِ مسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اِس امت کا ایک دائمی اور عالم گیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفریق کا موجب ہو سکتا ہو۔ اب جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و رہبر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذِ ہدایت کی طرف رُجوع کرنے کا قائل نہ ہو وہ اس برادری کا فرد ہے

QuranUrdu.com

اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہ وحدت اس امت کو کبھی نصیب نہ ہو سکتی تھی اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا۔ کیونکہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دُنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے، اور جب اس نبی کے ذریعے سے دین کی تکمیل بھی کر دی جائے، اور جب اس نبی کی تعلیم کو پوری طرح محفوظ بھی کر دیا جائے، تو نبوت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے، تاکہ اس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو کر تمام دُنیا میں ہمیشہ کے لیے اہلِ ایمان کی ایک ہی اُمت بن سکے اور بلا ضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس اُمت میں بار بار تفرِقہ نہ برپا ہوتا رہے۔ نبی خواہ ''ظلّی'' ہو یا ''برُوزی''، اُمّتی ہو یا صاحبِ شریعت اور صاحبِ کتاب، بہرحال جو شخص نبی ہوگا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوگا، اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ماننے والے ایک اُمت بنیں اور نہ ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اس حالت میں تو ناگزیر ہے جب کہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو۔ مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو کفر و ایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے اور انھیں کبھی ایک امت نہ بننے دے۔ لہٰذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سنت اور اِجماع سے ثابت ہے، عقل بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے۔

''مسیحِ مَوعُود'' کی حقیقت

نئی نبوت کی طرف بلانے والے حضرات عام طور پر ناواقف مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ احادیث میں ''مسیحِ مَوعُود'' کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اور مسیح نبی تھے، اس لیے اُن کے آنے سے ختمِ نبوت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ختمِ نبوت بھی برحق اور اس کے باوجود مسیح موعود کا آنا بھی برحق۔

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مسیحِ مَوعُود'' سے مراد عیسٰیؑ ابنِ مریم نہیں ہیں۔ ان کا تو انتقال ہو چکا۔ اب جس کے آنے کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ مثیلِ مسیح، یعنی حضرت عیسٰیؑ کے مانند ایک مسیح ہے، اور وہ فلاں شخص ہے جو آ چکا ہے۔ اُس کا ماننا عقیدۂ ختمِ نبوت کے خلاف نہیں ہے۔

اِس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہم یہاں پورے حوالوں کے ساتھ وہ مستند روایات نقل کیے دیتے ہیں جو اس مسئلے کے متعلق حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان احادیث کو دیکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور آج اس کو کیا بنایا جا رہا ہے۔

احادیث در باب نزولِ عیسٰی ابنِ مریم علیہ السلام

(۱) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللّٰہ — حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

QuranUrdu.com

صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الحرب ویفیض المال حتّٰی لایقبلہٗ احدٌ حتّٰی تکون السجدۃ الواحدۃ خیرًا من الدّنیا وما فیہا (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسٰی ابنِ مریم۔ مسلم، باب بیانِ نزولِ عیسٰی۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی نزولِ عیسٰی۔ مُسنَدِ احمد، مرُویّات ابو ہریرہؓ)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اُتریں گے تمھارے درمیان ابنِ مریمؑ حاکم عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور خنزیر کو ہلاک کر دیں گے[1]، اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے (دُوسری رِوایت میں حرب کے بجائے جزیہ کا لفظ ہے، یعنی جزیہ ختم کر دیں گے[2]) اور مال کی وہ کثرت ہو گی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا، اور (حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور) ایک سجدہ کر لینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا۔

(۲) ایک اور رِوایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لا تقوم الساعۃ حتّٰی ینزل عیسٰی ابن مریم ...... ”قیامت قائم نہ ہو گی جب تک نازل نہ ہولیں عیسٰی ابنِ مریمؑ“...... اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اُوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ (بخاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب۔ ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدّجّال)

(۳) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم (بخاری، کتاب احادیث الانبیا، باب نزول عیسٰی۔ مسلم، باب بیان نزولِ عیسٰی۔ مُسنَدِ احمد، مَرویّاتِ ابی ہریرہؓ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیسے ہو گے تم، جب کہ تمھارے درمیان ابنِ مریمؑ اُتریں گے اور تمھارا امام اُس وقت خود تم میں سے ہو گا۔[3]

---

[1] صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اِکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسٰیؑ) کو صلیب پر ”لعنت“ کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفّارہ بن گیا۔ اور انبیاؑ کی امتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیّت یہ ہے کہ انھوں نے صرف اِس عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی حتّٰی کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاؑ کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسٰی علیہ السلام آ کر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا، تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو نہ اپنے پیروؤں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیّت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

[2] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس وقت ملّتوں کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک ملّتِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہو گی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے احادیث نمبر ۵ و ۱۵ دلالت کر رہی ہیں۔

[3] یعنی نماز میں حضرت عیسٰیؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہو گا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔

QuranUrdu.com

(۴) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ینزل عیسٰی ابن مریم فیقتل الخنزیر ویمحوا الصلیب و تجمع لہ الصلٰوۃ ویعطی المال حتی لایقبل ویضع الخراج وینزل الرّوحاء فیحجّ منھا، اویعتمر، او یجمعھما۔ (مُسْنَدِ احمد، بسلسلۂ مَرویّاتِ ابی ھُریرۃؓ۔ مسلم، کتاب الحج، باب جواز التمتّع فی الحج والقِران)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عیسٰی ابنِ مریمؑ نازل ہوں گے، پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا اور وہ خَراج ساقط کر دیں گے اور رَوحا[1] کے مقام پر منزل کر کے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یا دونوں کو جمع کریں گے۔[2] راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے ان میں سے کون سی بات فرمائی تھی۔

(۵) عن ابی ھریرۃ (بعد ذکر خروج الدجال) فبینما ھم یعدّون للقتال یسوّون الصّفوف اذا اقیمت الصّلٰوۃ فینزل عیسٰی ابن مریم فامّھم فاذا راٰہ عدو اللّٰہ یذوب کما یذوب الملح فی الماء فلو ترکہ لا نذاب حتّٰی یھلک ولٰکن یقتلہ اللّٰہ بیدہ فیریھم دمہ فی حربتہ۔ (مِشکوٰۃ، کتاب الفتن، باب الملاحم، بحوالۂ مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے (دجّال کے خُروج کا ذکر کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا:) اس اثنا میں کہ مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے، صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے تکبیرِ اقامت کہی جا چکی ہوگی کہ عیسٰی ابنِ مریمؑ نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن (یعنی دجال) ان کو دیکھتے ہی اس طرح گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گُھلتا ہے۔ اگر عیسٰی علیہ السلام اس کو اُس کے حال ہی پر چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گھل کر مر جائے۔ مگر اللہ اس کو اُن کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور وہ اپنے نیزے میں اُس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔

(۶) عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لیس بینی وبینہ نبی (یعنی عیسٰی) وانہ نازل فاذا رأیتموہ فاعرفوہ رجل مربوع الی الحمرۃ والبیاض، ممصرتین کان رأسہ یقطر وَان لم یصبہ بلل فیقاتل النّاس علی الاسلام فیدقِ الصلیب ویقتل الخنزیر

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اور اُن (یعنی عیسٰی علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اُترنے والے ہیں، پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں، رنگ مائل بہ سرخی و سپیدی ہے، دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔

---

[1] مدینے سے ۳۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

[2] واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کو مثیلِ مسیح قرار دیا گیا ہے، انھوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عمرہ۔

QuranUrdu.com

ویضع الجزیة ویهلك اللّٰه فی زمانه الملل کلها الا الاسلام ویهلك المسیح الدجال فیمکث فی الارض اربعین سنة ثم یتوفی فیصلی علیه المسلمون۔ (ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدّجال۔ مُسْنَدِ احمد، مَرویّاتِ ابوہُریرہؓ)

ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالانکہ وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، اور اللہ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام مِلّتوں کو مٹا دے گا، اور وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے، اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھیریں گے۔ پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔

(۷) عن جابر بن عبداللّٰه قال سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ...... فینزل عیسٰی بن مریم صلی اللّٰه علیه وسلم فیقول امیرهم تعال فصلِّ فیقول لا ان بعضکم علٰی بعض امراء تکرمة اللّٰه هٰذه الامة۔ (مسلم، بیانِ نُزولِ عیسٰی ابنِ مریم۔ مُسْنَدِ احمد بسلسلۂ مَرویّاتِ جابرؓ بن عبداللہ)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ...... پھر عیسٰی ابنِ مریمؑ نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا کہ آیئے، آپ نماز پڑھایئے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو۔[1] یہ وہ اُس عزت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اِس اُمّت کو دی ہے۔

(۸) عن جابر بن عبداللّٰه (فی قصة ابن صیّاد) فقال عمر بن الخطاب ائذن لی فاقتله یا رسول اللّٰه فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان یکن هو فلست صاحبه انما صاحبه عیسٰی ابن مریم علیه الصلٰوة والسلام، وان لا یکن فلیس لك ان تقتل رجلا من اهل العهد۔ (مشکٰوۃ، کتاب الفتن، باب قصۂ ابنِ صَیّاد، بحوالہ شرح السُّنّہ بَغَوی)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ (قصۂ ابنِ صَیّاد کے سلسلے میں) رِوایَت کرتے ہیں کہ پھر عمرؓ بن خطّاب نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو بلکہ اسے تو عیسٰی ابن مریمؑ ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمھیں اہلِ عہد (یعنی ذِمّیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(۹) عن جابر بن عبداللّٰه (فی قصّة الدجّال) فاذا هم بعیسٰی ابن مریم علیه السلام فتقام الصلٰوة فیقال له تقدم یا روح

حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے رِوایَت ہے کہ (دجّال کا قصہ بیان کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اُس وقت یکایک عیسٰی ابنِ مریمؑ علیہ السلام

[1] یعنی تمھارا امیر خود تم ہی میں سے ہونا چاہیے۔

QuranUrdu.com

اللّٰہ فیقول لیتقدم امامکم فلیصلِّ بکم فاذا صلی صلٰوۃ الصبح خرجوا الیه قال فحین یری الکذاب ینماث کما ینماث الملح فی الماء فیمشی الیه فقتلهٗ حتّٰی ان الشجر والحجر ینادی یا روح اللّٰہ ھذا الیھودیُّ، فلا یترک ممن کان یتبعه احدا الا قتلهٗ۔ (مُسْنَدِ احمد، بسلسلۂ روایاتِ جابرؓ بن عبداللہ)

مسلمانوں کے درمیان آ جائیں گے۔ پھر نماز کھڑی ہوگی اور ان سے کہا جائے گا کہ اے رُوح اللہ! آگے بڑھیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تمھارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے، وہی نماز پڑھائے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہوکر مسلمان دجّال کے مقابلے پر نکلیں گے۔ فرمایا: جب وہ کذّاب حضرت عیسیٰؑ کو دیکھے گا تو گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اسے قتل کر دیں گے، اور حالت یہ ہوگی کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے کہ اے روح اللہ! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ دجّال کے پیروؤں میں سے کوئی نہ بچے گا جسے وہ (یعنی عیسیٰؑ) قتل نہ کر دیں۔

(۱۰) عن النواس بن سمعان (فی قصة الدجّال) فبینما ھو کذٰلك اذ بعث اللّٰہ المسیح بن مریم فینزل عند المنارة البیضاء شرقی دمشق بین مهروذتین واضعًا کفیه علٰی اجنحة ملکین اذا طأطأ راسهٗ قطر واذا رفعه تحدر منه جمان کاللؤلؤ فلا یحل لکافر یجد ریح نفسه الا مات ونفسه ینتهی الٰی حیث ینتهی طرفه فیطلبه حتّٰی یدرکه بباب لُدٍّ فیقتلهٗ۔ (مسلم، ذکر الدجال۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خُروج الدجال۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی فتنة الدجال۔ ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنة الدجال)

حضرت نوّاس بن سَمْعان کِلابی (قصّۂ دجال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں: اس اثنا میں کہ دجال یہ کچھ کر رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیحؑ ابنِ مریم کو بھیج دے گا اور وہ دِمَشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس، زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اُتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی ـــــ اور وہ ان کی حدِّ نظر تک جائے گی ـــــ وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابنِ مریم دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ[1] کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

(۱۱) عن عبد اللّٰہ بن عمر وقال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یخرج الدجال

حضرت عبداللہ بن عَمْرُوؓ بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجّال میری اُمّت

[1] واضح رہے کہ لُدّ (Lydda) فلسطین میں ریاستِ اسرائیل کے دار السلطنت تَلّ اَبِیْب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈّا بنا رکھا ہے۔

QuranUrdu.com

فی امتی فیمکث اربعین (لا ادری اربعین یومًا او اربعین شھرًا او اربعین عامًا) فیبعث اللّٰہ عیسٰی ابن مریم کانہ عروۃ بن مسعود فیطلبہ فیھلکہ ثم یمکث الناس سبع سنین لیس بین اثنین عداوۃ۔(مسلم، ذکر الدجال)

میں نکلے گا اور چالیس (میں نہیں جانتا چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال[1]) رہے گا۔ پھر اللہ عیسیٰؑ ابنِ مریم کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عُروہؓ بن مسعود (ایک صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ وہ اس کا پیچھا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے، پھر سات سال تک لوگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔

(۱۲) عن حذیفۃ بن اسید الغفاری قال اطلع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علینا ونحن نتذاکر قال ما تذکرون قالوا نذکر الساعۃ قال انھا لن تقوم حتّٰی ترون قبلھا عشر اٰیات فذکر الدخان والدجال والدابۃ وطلوع الشمس من مغربھا ونزول عیسٰی ابن مریم ویاجوج وماجوج وثلثۃ خسوف، خسف بالمشرق وخسف بالمغرب، وخسف بجزیرۃ العرب واٰخر ذٰلک نار تخرج من الیمن تطرد الناس الٰی محشرھم ۔ (مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعہ۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب امارات الساعہ)

حُذَیفہؓ بن اَسِید الغِفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا: کیا بات ہو رہی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا: وہ ہرگز قائم نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہوجائیں۔ پھر آپؐ نے وہ دس نشانیاں یہ بتائیں: (۱) دُھواں، (۲) دجّال، (۳) دابّۃ الارض، (۴) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، (۵) عیسیٰؑ ابنِ مریم کا نزول، (۶) یاجوج و ماجوج، (۷) تین بڑے خَسَف[2]، ایک مشرق میں، (۸) دوسرا مغرب میں، (۹) تیسرا جزیرۃ العرب میں، (۱۰) سب سے آخر میں ایک زبردست آگ جو یمن سے اٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔

(۱۳) عن ثوبان مولٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عصابتان من امتی احرزھما اللّٰہ تعالٰی من النار۔ عصابۃ تغزو الھند، وعصابۃ تکون مع عیسٰی ابن مریم علیہ السلام۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثَوبانؓ رِوایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ''میری امت کے دو لشکر ایسے ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچالیا۔ ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو عیسیٰؑ ابن مریمؑ کے

[1] یہ حضرت عبداللہؓ بن عَمروؓ بن عاص کا اپنا قول ہے۔

[2] زمین دھنس جانا (landslide)

QuranUrdu.com

(نسائی، کتاب الجہاد۔ مُسندِ احمد، بسلسلۂ رِوایاتِ ثوبانؓ)

ساتھ ہوگا۔''

(۱۴) عن مُجمّع بن جارية قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يقتل ابنُ مريم الدّجّال بباب لُدّ۔

(مُسندِ احمد۔ ترمذی، ابواب الفتن)

مُجمّعؓ بن جاریہ انصاری کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ابنِ مریمؑ دجّال کو لُدّ کے دروازے پر قتل کریں گے۔

(۱۵) عن ابی اُمامة الباهلی (فی حدیث طویل فی ذکر الدجال) فبینما امامهم قد تقدم یصلّی بهم الصبح اذ نزل علیهم عیسٰی ابن مریم فرجع ذٰلك الامام ینکص یمشی قهقریٰ لیتقدم عیسٰی فیضع عیسٰی یده بین کتفیه ثم یقول له تقدم فصل فانها لك اقیمت فیصلّی بهم امامهم فاذا انصرف قال عیسٰی علیه السلام افتحوا الباب فیفتح ووراءه الدجال ومعه سبعون الف یهودی کلهم ذوسیف محلی وساج فاذا نظر الیه الدجال ذاب کما یذوب الملح فی الماء وینطلق هاربًا ویقول عیسٰی ان لی فیك ضربة لن تسبقنی بها فیدرکه عند باب اللُدِّ الشرقی فیهزم الله الیهود ...... وتملأ الارض من المسلم کما یملأ الاناء من الماء وتکون الکلمة واحدة فلا یعبد الا الله تعالٰی۔

(ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنة الدجّال)

ابواُمامہ باہلیؓ (ایک طویل حدیث میں دجال کا ذکر کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ عین اس وقت جب مسلمانوں کا امام صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا، عیسٰیؑ ابنِ مریم اُن پر اتر آئیں گے۔ امام پیچھے پلٹے گا تاکہ عیسٰیؑ آگے بڑھیں، مگر عیسٰیؑ اس کے شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ نہیں تم ہی نماز پڑھاؤ کیونکہ یہ تمھارے لیے ہی کھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسٰی علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو، چنانچہ وہ کھولا جائے گا۔ باہر دجال ۷۰ ہزار مُسلّح یہودیوں کے ساتھ موجود ہوگا۔ جونہی کہ عیسٰی علیہ السلام پر اس کی نظر پڑے گی، وہ اس طرح گُھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گُھلتا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا۔ عیسٰیؑ کہیں گے: میرے پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو بچ کر نہ جاسکے گا۔ پھر وہ اسے لُد کے مشرقی دروازے پر جالیں گے اور اللہ یہودیوں کو ہرا دے گا ...... اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی جیسے برتن پانی سے بھر جائے۔ سب دنیا کا کلِمہ ایک ہوجائے گا اور اللہ تعالٰی کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔

(۱۶) عن عثمان بن ابی العاص قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ...... وینزل عیسٰی ابن مریم

عثمانؓ بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے ...... اور عیسٰی ابنِ مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے وقت

QuranUrdu.com

علیه السلام عند صلوٰة الفجر فیقول له امیرهم یا روح الله تقدم صلّ، فیقول هٰذه الامة بعضهم امراء علٰی بعض فیتقدم امیرهم فیصلی، فاذا قضٰی صلٰوته اخذ عیسٰی حربته فیذهب نحو الدجال فاذا یراه الدجال ذاب کما یذوب الرصاص فیضع حربته بین شندوبته فیقتله وینهزم اصحابه لیس یومئذ شئ یواری منهم احدا حتّٰی ان الشجر لیقول یا مومن هٰذا کافر ویقول الحجر یا مومن هٰذا کافر۔
(مُسندِ احمد۔طَبرانی۔حاکم)

اتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ اے روح اللہ! آپ نماز پڑھائیے۔ وہ جواب دیں گے کہ اس اُمت کے لوگ خود ہی ایک دوسرے پر امیر ہیں۔ تب مسلمانوں کا امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھائے گا۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسٰیؑ اپنا حربہ لے کر دجّال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب ان کو دیکھے گا تو اس طرح پگھلے گا جیسے سیسا پگھلتا ہے۔ عیسٰی علیہ السلام اپنے حربے سے اس کو ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے، مگر کہیں انھیں چھُپنے کو جگہ نہ ملے گی، حتّٰی کہ درخت پکاریں گے: اے مومن! یہ کافر یہاں موجود ہے، اور پتھر پکاریں گے کہ اے مومن! یہ کافر یہاں موجود ہے۔

(۱۷) عن سمرة بن جُنْدُب عن النبی صلی الله علیه وسلم (فی حدیث طویل) فیصبح فیهم عیسٰی ابن مریم فیهزمه الله وجنوده حتّٰی ان اجذم الحائط واصل الشجر لینادی یا مومن هٰذا کافرٌ یستتربی فتعال اقتله۔ (مُسندِ احمد۔حاکم)

سَمُرہؓ بن جُندُب (ایک طویل حدیث میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رِوایت کرتے ہیں: پھر صبح کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسٰیؑ ابن مریم آ جائیں گے اور اللہ دجال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا، یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اٹھیں گی کہ اے مومن! یہ کافر میرے پیچھے چھُپا ہوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔

(۱۸) عن عمران بن حصین انّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا تزال طائفة من امتی علی الحق ظاهرین علٰی من ناوأهم حتّٰی یاتی امر الله تبارك وتعالٰی وینزل عیسٰی ابن مریم علیه السلام۔
(مُسندِ احمد)

عمرانؓ بن حُصَین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری ہوگا، یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالٰی کا فیصلہ آ جائے اور عیسٰی ابن مریم علیہ السلام نازل ہو جائیں۔

(۱۹) عن عائشةؓ (فی قصّة الدجّال) فینزل عیسٰی علیه السلام فیقتله ثم یمکث عیسٰی علیه السلام فی الارض اربعین

حضرت عائشہؓ (دجال کے قصے میں) روایت کرتی ہیں: پھر عیسٰی علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسٰی علیہ السلام

QuranUrdu.com

سنة اماما عادلاً وَحَكَمًا مُقسطًا ۔ (مُسندِ احمد)

چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکمِ منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔

(۲۰) عن سفينة مولٰى رسول الله صلى الله عليه وسلم (فى قصّة الدجّال) فينزل عيسٰى عليه السلام فيقتله الله تعالٰى عند عقبة اَفِيق ۔ (مُسندِ احمد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سَفِینہ (دجّال کے قصے میں) روایت کرتے ہیں: پھر عیسٰی علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجّال کو اَفِیق[1] کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔

(۲۱) عن حذيفة (فى ذكر الدجّال) فلما قاموا يصلّون نزل عيسٰى ابن مريم امامهم فصلّى بهم فلما انصرف قال هٰكذ افرجوا بينى و بين عدو الله...... ويسلط الله عليهم المسلمين فيقتلونهم حتّٰى ان الشجر والحجر لينادى يا عبدالله يا عبدالرحمٰن يا مسلم هٰذا اليهودى فاقتلهم فيفنيهم الله تعالٰى ويظهر المسلمون فيكسرون الصليب ويقتلون الخنزير ويضعون الجزية ۔ (مُستدرک حاکم۔ مسلم میں بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ آئی ہے۔ اور حافظ ابنِ حَجَر نے فتح الباری، جلد ۶، ص ۴۵۰ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

حضرت حُذَیفہؓ بن یمان (دجّال کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کرتے ہیں: پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں گے تو اُن کی آنکھوں کے سامنے عیسٰیؑ ابنِ مریم اُتر آئیں گے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے۔ پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ میرے اور اس دشمنِ خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ...... اور اللہ دجال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو مسلط کر دے گا اور مسلمان انھیں خوب ماریں گے، یہاں تک کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے: اے عبداللہ! اے عبدالرحمٰن! اے مسلمان! یہ رہا ایک یہودی، مار اِسے۔ اس طرح اللہ ان کو فنا کر دے گا اور مسلمان غالب ہوں گے اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ ساقط کر دیں گے۔

یہ جملہ ۲۱ رِوایات ہیں جو ۱۴ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگر چہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے، لیکن طولِ کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ رِوایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

---

[1] اَفِیق، جسے آج کل فِیق کہتے ہیں، شام اور اسرائیل کی سرحد پر موجودہ ریاست شام کا آخری شہر ہے۔ اس کے آگے مغرب کی جانب چند میل کے فاصلے پر طَبَرِیَّہ نامی جھیل ہے جس میں سے دریائے اُرْدُن نکلتا ہے، اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فٹ تک گہرائی میں اُتر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے دریائے اُرْدُن طَبَرِیَّہ میں سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عَقَبۂ اَفِیق (افیق کی گھاٹی) کہتے ہیں۔

QuranUrdu.com

ان احادیث سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی ''مسیح موعود'' یا ''مثیلِ مسیح'' یا ''بُروزِ مسیح'' کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اِس امر کی کوئی گنجایش ہے کہ کوئی شخص اِس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ میں ہی وہ مسیح ہوں جس کے آنے کی سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں اُن عیسٰی علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو اَب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لا حاصل ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں یا زندہ کہیں موجود ہیں۔ بالفرض وہ وفات ہی پا چکے ہوں تو اللہ انھیں زندہ کر کے اُٹھا لانے پر قادر ہے[1] وگرنہ یہ بات بھی اللہ کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات میں کہیں ہزار ہا سال تک زندہ رکھے اور جب چاہے دنیا میں واپس لے آئے۔ بہر حال اگر کوئی شخص حدیث کو مانتا ہو تو اُسے یہ ماننا پڑے گا کہ آنے والے وہی عیسٰی ابنِ مریمؑ ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص حدیث کو نہ مانتا ہو تو وہ سرے سے کسی آنے والے کی آمد کا قائل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ احادیث کے سوا کسی اَور چیز پر مبنی نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب مذاق ہے کہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ تو لے لیا جائے احادیث سے اور پھر انھی احادیث کی اس تصریح کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ آنے والے عیسٰیؑ ابنِ مریمؑ ہوں گے نہ کہ کوئی مثیلِ مسیح۔

دوسری بات جو اتنی ہی وضاحت کے ساتھ اِن احادیث سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ ابنِ مریم کا یہ دوبارہ نُزول نبی مقرر ہو کر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہوگا۔ نہ ان پر وحی نازل ہوگی، نہ وہ خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام یا نئے احکام لائیں گے، نہ وہ شریعتِ محمدیؐ میں کوئی اضافہ یا کوئی کمی کریں گے، نہ اُن کو تجدیدِ دین کے لیے دنیا میں لایا جائے گا، نہ وہ آ کر لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیں گے، اور نہ وہ اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائیں گے۔[2] وہ صرف

---

[1] جو لوگ اس بات کا انکار کرتے ہیں انھیں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۹ مُلاحَظہ فرما لینی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بندے کو ۱۰۰ برس تک مُردہ رکھا اور پھر زندہ کر دیا: فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ۔

[2] علمائے اسلام نے اس مسئلے کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ علامہ تفتازانی (۷۲۲ھ - ۷۹۲ھ) شرح عقائدِ نَسَفی میں لکھتے ہیں:

ثبت انه اٰخر الانبیاء ...... فان قیل قد روی فی الحدیث نزول عیسٰی علیه السلام بعدهٗ قلنا نعم لٰکنّه یتابع محمدًا علیه السلام لأن شریعته قد نسخت فلا یکون الیه وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفة رسول اللّٰه علیه السلام۔ (طَبع مصر، ص ۱۳۵)

یہ ثابت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں...... اگر کہا جائے کہ آپؐ کے بعد عیسٰی علیہ السلام کے نزول کا ذکر احادیث میں آیا ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہاں، آیا ہے، مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے، کیونکہ ان کی شریعت تو منسوخ ہو چکی ہے اس لیے نہ ان کی طرف وحی ہوگی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔

QuranUrdu.com

ایک کارِخاص کے لیے بھیجے جائیں گے، اور وہ یہ ہوگا کہ دجّال کے فتنے کا اِستیصال کر دیں۔ اس غرض کے لیے وہ ایسے طریقے سے نازل ہوں گے کہ جن مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا انھیں اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ عیسیٰؑ ابنِ مریم ہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں۔ وہ آ کر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے، جو بھی مسلمانوں کا امام اُس وقت ہوگا اسی کے پیچھے نماز پڑھیں گے[1] اور جو بھی اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا، اسی کو آگے رکھیں گے، تاکہ اِس شبہ کی کوئی ادنیٰ سی گنجایش بھی نہ رہے کہ وہ اپنی سابق پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض انجام دینے کے لیے واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر۔ پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آ کر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خود بخود اس امر کا اعلان ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں، اور اس بنا پر ان کی آمد سے مُہرِ نبوت کے ٹوٹنے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔

اُن کا آنا بلاتشبیہ اسی نوعیت کا ہوگا جیسے ایک صدرِ ریاست کے دَور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی کوئی خدمت انجام دے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک صدر کے دَور میں کسی سابق صدر کے محض آ جانے سے آئین نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دو صورتوں میں آئین کی خلاف ورزی لازم آتی ہے: ایک، یہ کہ سابق صدر آ کر پھر سے فرائضِ صدارت سنبھالنے کی کوشش کرے۔ دوسرے، یہ کہ کوئی شخص اس کی سابق صدارت کا بھی انکار کر دے،

اور یہی بات علامہ آلُوسیؒ تفسیر رُوح المعانی میں کہتے ہیں:

ثم انه علیه السلام حین ینزل باق علی نبوته السابقة لم یعزل عنها بحال لکنه لا یتعبد بها لنسخها فی حقه وحق غیره وتکلیفه باحکام هذه الشریعة اصلاً وفرعًا فلا یکون الیه علیه السلام وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفة لرسول الله صلی الله علیه وسلم و حاکما من حکام ملته بین امته۔ (جلد ۲۲، ص ۳۲)

پھر، عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو وہ اپنی سابق نبوت پر باقی ہوں گے، بہرحال اس سے معزول تو نہ ہو جائیں گے، مگر وہ اپنی پچھلی شریعت کے پَیرو نہ ہوں گے کیونکہ وہ ان کے اور دوسرے سب لوگوں کے حق میں منسوخ ہو چکی ہے، اور اب وہ اُصول اور فُروع میں اِس شریعت کی پیروی پر مکلّف ہوں گے، لہٰذا اُن پر نہ اب وحی آئے گی اور نہ انھیں احکام مقرر کرنے کا اختیار ہوگا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور آپؐ کی اُمت میں مِلّتِ محمدؐیہ کے حاکموں میں سے ایک حاکم کی حیثیت سے کام کریں گے۔

امام رازیؒ اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

انتهاء الانبیاء الی مبعث محمد صلی الله علیه وسلم فعند مبعثه انتهت تلك المدة فلا یبعد ان یصیر (ای عیسی ابن مریم) بعد نزوله تبعًا لمُحمّد (تفسیر کبیر، ج ۳، ص ۳۴۳)

انبیاؑ کا دَور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت تک تھا۔ جب آپؐ مبعوث ہو گئے تو انبیاؑ کی آمد کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نازل ہونے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے۔

1 اگرچہ دو روایتوں (نمبر ۵ و ۲۱) میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد پہلی نماز خود پڑھائیں گے،

QuranUrdu.com

کیونکہ یہ اُن تمام کاموں کے جواز کو چیلنج کرنے کا ہم معنٰی ہوگا جو اس کے دَورِ صدارت میں انجام پائے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہ ہو تو بجائے خود سابق صدر کی آمد آئینی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ یہی معاملہ حضرت عیسٰی کی آمدِ ثانی کا بھی ہے کہ ان کے محض آجانے سے ختمِ نبوت نہیں ٹوٹتی۔ البتہ اگر وہ آ کر پھر نبوت کا منصب سنبھال لیں اور فرائضِ نبوت انجام دینے شروع کر دیں، یا کوئی شخص ان کی سابق نبوت کا بھی انکار کر دے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے آئینِ نبوت کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ احادیث نے پوری وضاحت کے ساتھ دونوں صورتوں کا سدِّ باب کر دیا ہے۔ ایک طرف وہ تصریح کرتی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ اور دوسری طرف وہ خبر دیتی ہیں کہ عیسٰیؑ ابنِ مریم دوبارہ نازل ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی یہ آمدِ ثانی منصبِ نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے نہ ہوگی۔

اسی طرح ان کی آمد سے مسلمانوں کے اندر کفر و ایمان کا بھی کوئی نیا سوال پیدا نہ ہوگا۔ اُن کی سابقہ نبوت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہو جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی اُس نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور آپ کی ساری اُمت ابتدا سے ان کی مومن ہے۔ یہی حیثیت اُس وقت بھی ہوگی۔ مسلمان کسی تازہ نبوت پر ایمان نہ لائیں گے، بلکہ عیسٰیؑ ابنِ مریم کی سابقہ نبوت ہی پر ایمان رکھیں گے جس طرح آج رکھتے ہیں۔ یہ چیز نہ آج ختمِ نبوت کے خلاف ہے نہ اُس وقت ہوگی۔

آخری بات جو اِن احادیث سے، اور بکثرت دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دجّال، جس کے فتنۂ عظیم کا اِستیصال کرنے کے لیے حضرت عیسٰی ابنِ مریم علیہ السلام کو بھیجا جائے گا، یہودیوں میں سے ہوگا اور اپنے آپ کو "مسیح" کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصورات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل پے در پے تنزل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخرِ کار بابِل اور اَسیریا کی سلطنتوں نے ان کو غلام بنا کر زمین میں تِتَّر بِتَّر کر دیا، تو انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو خوشخبری دینی شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک "مسیح" آنے والا ہے جو ان کو اس ذلت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشین گوئیوں کی بنا پر یہودی ایک مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لڑ کر ملک فتح کرے، بنی اسرائیل کو ملک ملک سے لا کر فلسطین میں جمع کر دے، اور ان کی ایک زبردست سلطنت قائم کر دے۔ لیکن ان کی اِن توقعات کے خلاف جب حضرت عیسٰی ابنِ مریم علیہ السلام خدا کی طرف سے مسیح ہو کر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انھیں ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ اُس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اُس مسیحِ مَوعُود (Promised Messiah) کے منتظر ہیں جس کے آنے کی خوش خبریاں ان کو دی گئی تھیں۔ اُن کا لٹریچر اس آنے والے دَور کے سہانے خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔ تلمُود اور رِبّیوں کے ادبیات میں اُس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اُس کی خیالی لذت کے سہارے صدیوں سے یہودی جی رہے ہیں اور یہ اُمید لیے بیٹھے ہیں کہ یہ مسیحِ مَوعُود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہوگا جو دریائے نیل سے دریائے فُرات تک کا علاقہ (جسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں) انھیں واپس دلائے گا، اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لا کر اس ملک میں پھر سے جمع کر دے گا۔

لیکن بیشتر اور قوی تر روایات (نمبر ۳، ۷، ۹، ۱۵، ۱۶) یہی کہتی ہیں کہ وہ نماز میں امامت کرانے سے انکار کریں گے اور جو اس وقت مسلمانوں کا امام ہوگا اسی کو آگے بڑھائیں گے۔ اسی بات کو محدثین اور مفسرین نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔

QuranUrdu.com

اب اگر کوئی شخص مشرقِ وسطیٰ کے حالات پر ایک نگاہ ڈالے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے پس منظر میں ان کو دیکھے تو وہ فوراً یہ محسوس کرے گا کہ اُس دجّالِ اکبر کے ظہور کے لیے اسٹیج بالکل تیار ہو چکا ہے جو حضورؐ کی دی ہوئی خبروں کے مطابق یہودیوں کا ''مسیحِ مَوعُود'' بن کر اُٹھے گا۔ فلسطین کے بڑے حصّے سے مسلمان بے دخل کیے جا چکے ہیں اور وہاں اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی ہے۔ اس ریاست میں دنیا بھر کے یہودی کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں۔ امریکا، برطانیہ اور فرانس نے اس کو ایک زبردست جنگی طاقت بنا دیا ہے۔ یہودی سرمایے کی بے پایاں امداد سے یہودی سائنس داں اور ماہرینِ فُنون اُس کو روز افزوں ترقی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی یہ طاقت گردوپیش کی مسلمان قوموں کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن گئی ہے۔ اس ریاست کے لیڈروں نے اپنی اس تمنا کو کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے کہ وہ اپنی ''میراث کا ملک'' حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کی یہودی سلطنت کا جو نقشہ وہ ایک مدت سے کُھلّم کُھلّا شائع کر رہے ہیں، اُسے مقابل کے صفحے پر مُلاحَظہ فرمائیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پورا شام، پورا لُبنان، پورا اُردُن اور تقریباً سارا عراق لینے کے علاوہ ترکی سے اسکندرون، مصر سے سینا اور ڈیلٹا کا علاقہ، اور سعودی عرب سے بالائی حجاز و نجد کا علاقہ لینا چاہتے ہیں جس میں مدینۂ منورہ بھی شامل ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ کسی عالَم گیر جنگ کی ہڑبونگ سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ٹھیک اس موقع پر وہ دجّالِ اکبر اُن کا مسیحِ مَوعُود بن کر اُٹھے گا جس کے ظہور کی خبر دینے ہی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اُس زمانے میں مسلمانوں پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ ایک دن ایک سال کے برابر محسوس ہو گا۔ اسی بنا پر آپؐ فتنۂ مسیحِ دجّال سے خود بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے اور اپنی اُمت کو بھی پناہ مانگنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اِس مسیحِ دجّال کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مَثیلِ مسیح کو نہیں بلکہ اُس اصلی مسیح کو نازل فرمائے گا جسے دو ہزار برس پہلے یہودیوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا اور جسے وہ اپنی دانست میں صلیب پر چڑھا کر ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اس حقیقی مسیح کے نزول کی جگہ ہندوستان یا افریقا یا امریکا میں نہیں بلکہ دِمَشق میں ہو گی، کیونکہ یہی مقام اُس وقت عین محاذِ جنگ پر ہو گا۔ براہِ کرم دوسرے صفحے پر نقشہ مُلاحَظہ فرمائیے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسرائیل کی سرحد سے دِمَشق بمشکل ۵۰-۶۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں، ان کا مضمون اگر آپ کو یاد ہے تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہ ہو گی کہ مسیحِ دجال ۷۰ ہزار یہودیوں کا لشکر لے کر شام میں گُھسے گا اور دِمَشق کے سامنے جا پہنچے گا۔ ٹھیک اس نازک موقع پر دِمَشق کے مشرقی حصّے میں ایک سفید مینار کے قریب حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریم صبح دَم نازل ہوں گے اور نمازِ فجر کے بعد مسلمانوں کو اس کے مقابلے پر لے کر نکلیں گے۔ اُن کے حملے سے دجال پسپا ہو کر اَفِیق کی گھاٹی سے (مُلاحَظہ ہو: حدیث نمبر ۲۱) اسرائیل کی طرف پلٹے گا اور وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ آخرِ کار لُدّ کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر وہ ان کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ (حدیث نمبر ۱۰، ۱۴، ۱۵) اس کے بعد یہودی چُن چُن کر قتل کیے جائیں گے اور ملّتِ یہود کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (حدیث نمبر ۹، ۱۵، ۲۱) عیسائیت بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے اظہارِ حقیقت ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گی (حدیث نمبر ۱، ۲، ۴، ۶)، اور تمام ملتیں ایک ہی ملت مسلمہ میں ضم ہو جائیں گی۔ (حدیث نمبر ۶، ۱۵)

یہ ہے وہ حقیقت جو کسی اشتباہ کے بغیر احادیث میں صاف نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اس امر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ ''مسیحِ مَوعُود'' کے نام سے جو کاروبار ہمارے ملک میں پھیلایا گیا ہے، وہ ایک جَعَل سازی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

QuranUrdu.com

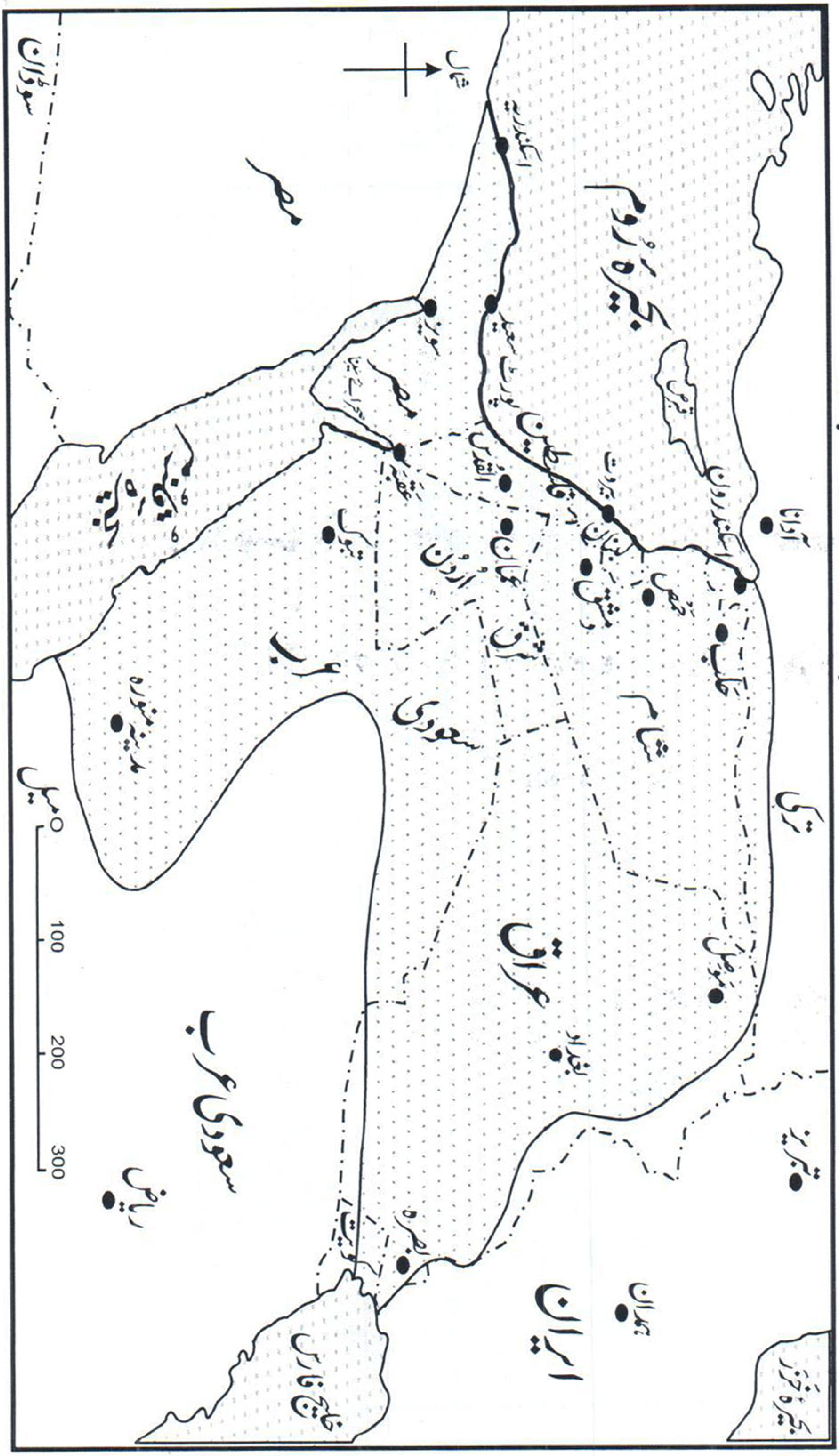

وہ سعودی ریاست جس کا خواب اسرائیل کے لیڈر دیکھ رہے ہیں

QuranUrdu.com

حقیقی مسیحؑ کے نزُول کا مقام

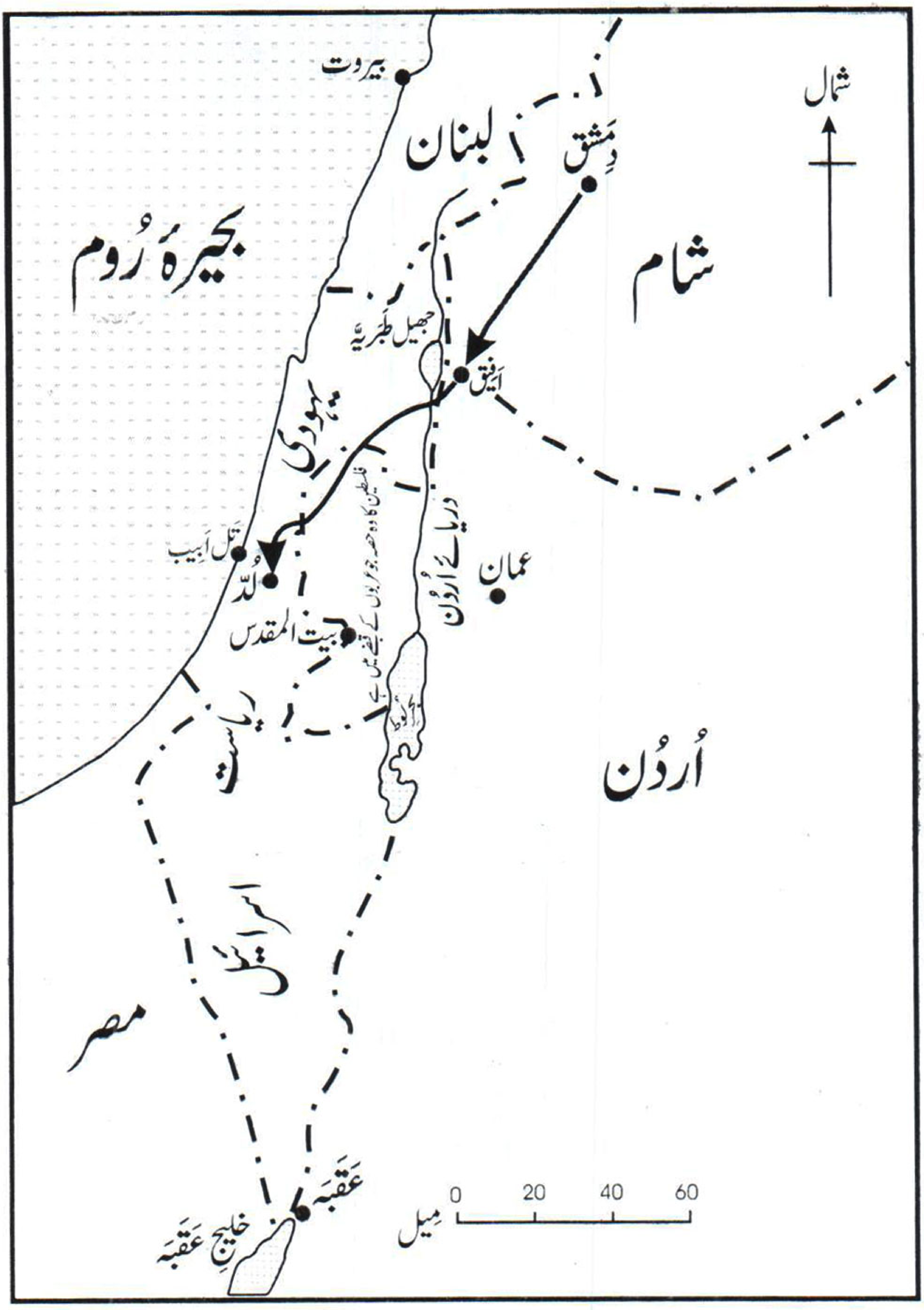

QuranUrdu.com

اس جعل سازی کا سب سے زیادہ مضحکہ انگیز پہلو یہ ہے کہ جو صاحب اپنے آپ کو ان پیشین گوئیوں کا مصداق قرار دیتے ہیں، انھوں نے خود عیسیٰؑ ابنِ مریم بننے کے لیے یہ دلچسپ تاویل فرمائی ہے:

''اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہینِ احمدیہ کے تیسرے حصّے میں میرا نام مریم رکھا۔ پھر جیسا کہ براہینِ احمدیہ سے ظاہر ہے، دو برس تک صفتِ مریمیت میں مَیں نے پرورش پائی ...... پھر ...... مریمؑ کی طرح عیسیٰؑ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا، اور آخر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اُس الہام کے جو سب سے آخر براہینِ احمدیہ کے حصّۂ چہارم میں درج ہے، مجھے مریم سے عیسیٰؑ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابنِ مریم ٹھیرا۔'' (کشتیِ نوح، ص ۸۷، ۸۸، ۸۹)

یعنی پہلے مریم بنے، پھر خود ہی حاملہ ہوئے، پھر اپنے پیٹ سے آپ عیسیٰؑ ابنِ مریم بن کر تولّد ہو گئے! اس کے بعد یہ مشکل پیش آئی کہ عیسیٰؑ ابنِ مریم کا نُزول تو احادیث کی رُو سے دِمَشق میں ہونا تھا جو کئی ہزار برس سے شام کا ایک مشہور و معروف مَقام ہے اور آج بھی دنیا کے نقشے پر اسی نام سے موجود ہے۔ یہ مشکل ایک دوسری پُرلطف تاویل سے یوں رفع کی گئی:

''واضح ہو کہ دِمَشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر منجانبِ اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبے کا نام دِمَشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطّبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پَیرو ہیں ...... یہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطّبع لوگ اس میں سُکونت رکھتے ہیں دِمَشق سے ایک مُشابہت اور مناسبت رکھتا ہے۔'' (حاشیۂ ازالۂ اَوہام، ص ۶۳ تا ۷۳)

پھر ایک اور اُلجھن یہ باقی رہ گئی کہ احادیث کی رُو سے ابنِ مریم کو ایک سفید مَنارَہ کے پاس اترنا تھا۔ چنانچہ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ مسیح صاحب نے آ کر اپنا مَنارَہ خود بنوا لیا۔ اب اسے کون دیکھتا ہے کہ احادیث کی رُو سے مَنارَہ وہاں ابنِ مریمؑ کے نزول سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا، اور یہاں وہ مسیحِ مَوعُود صاحب کی تشریف آوری کے بعد تعمیر کیا گیا۔

آخری اور زبردست اُلجھن یہ تھی کہ احادیث کی رُو سے تو عیسیٰؑ ابن مریم کو لُدّ کے دروازے پر دجّال کو قتل کرنا تھا۔ اِس مشکل کو رفع کرنے کی فکر میں پہلے طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں۔ کبھی تسلیم کیا گیا کہ لُدّ بیت المَقدِس کے دیہات میں سے ایک گاؤں کا نام ہے۔ (ازالۂ اَوہام، شائع کردہ انجمن احمدیہ لاہور، بتقطیع خُرد، ص ۲۲۰) پھر کہا گیا کہ ''لُدّ اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو بے جا جھگڑا کرنے والے ہوں ...... جب دجّال کے بے جا جھگڑے کمال تک پہنچ جائیں گے تب مسیحِ مَوعُود ظہور کرے گا اور اس کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دے گا۔'' (ازالۂ اَوہام، ص ۷۳۰) لیکن جب اس سے بھی بات نہ بنی تو صاف کہہ دیا گیا کہ لُد سے مراد لُدھیانہ ہے اور اس کے دروازے پر دجال کے قتل سے مراد یہ ہے کہ اشرار کی مُخالفت کے باوجود وہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ (الہُدیٰ، ص ۹۱)

اِن تاویلات کو جو شخص بھی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹے بہروپ (false impersenation) کا صریح ارتکاب ہے جو علَی الاعلان کیا گیا ہے۔